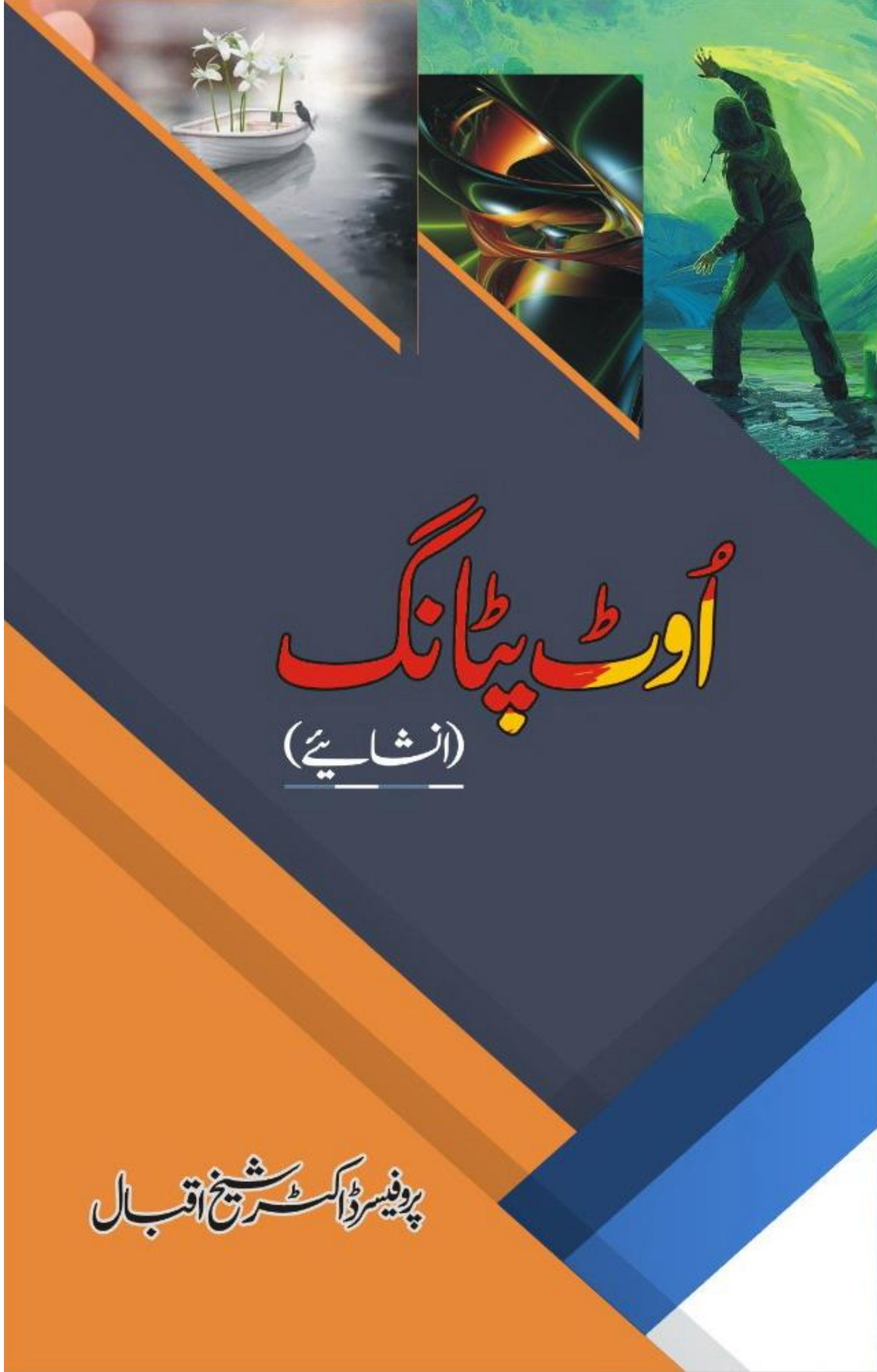

اُوٹ پٹانگ
(انشائیے)
پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال

اُوٹ پٹانگ

(انشائیے)

پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال

ایم اے انگلش، ایم اے اردو

ایم فل (گولڈ میڈلسٹ)، پی ایچ ڈی

نام کتاب:	اُوٹ پٹانگ
مصنف:	پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال
بار اوّل:	جنوری 2020
سرورق:	محمد اسماعیل
کمپوزنگ:	تنویر احمد
مطبع:	ثنائی برقی پریس سرگودہا
ناشر:	پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال
تعداد:	500
قیمت:	-/300 روپے

ملنے کا پتہ:

131۔ رحمت پارک یونیورسٹی روڈ سرگودہا

فون: 03004489399, 048-3221532

email. iqbalsheikh68@yahoo.com

شاہد بخاری

D-651 فیصل ٹاؤن لاہور

042-35161149, 03004855148

انتساب

ان شکستوں اور ہزیمتوں
کے نام
جنہوں نے مجھے
ہنسنا اور قہقہے لگانا
سکھا دیا

اُوٹ پٹانگ

فہرست

کچھ "اُوٹ پٹانگ" کے بارے میں

پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال بڑی وسیع المطالعہ شخصیت ہیں۔اللہ نے ان کو بڑی بصیرت سے نوازا ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ بولنا زندگی ہے اور خاموش ہو جانا موت ہے۔شیخ صاحب ماشاءاللہ دو درجن سے زیادہ کتابیں سنجیدہ موضوعات پر لکھ چکے ہیں۔اب انہوں نے سوچا ہے کہ کیوں نہ کچھ احمقانہ، بے ڈھنگی، بے تکی اور ظرافت آمیز باتیں کی جائیں۔"اوٹ پٹانگ" کے نام سے انہوں نے ایسی ہی باتوں کی جمع آوری کی ہے۔لیکن خیال رہے کہ ان کی ان لایعنی باتوں میں بڑی بامعنی باتیں بھی پوشیدہ ہیں۔انہوں نے ذہنی خرافات، انکل پچو، حماقتیں، بھوک اور عشق وشق وغیرہ کے موضوعات پر لکھتے ہوئے دانش کے کئی خوشنما اور نظر افروز موتی بھی بکھیر دیئے ہیں۔ مجھے "اوٹ پٹانگ" کے دیباچے کی تائید میں کچھ شعر بے ساختہ یاد آئے ہیں پہلا شعر دورِ حاضر کے ایک بڑے شاعر ڈاکٹر خورشید رضوی کا ہے۔

کوئی تیشہ تو چلا، کوئی شرارہ تو نکال
مدتیں بیت گئیں سوچ کو پتھرائے ہوئے

غالباً دوسرا شعر فارسی کے عظیم شاعر انوری کا ہے

دل از تمکیں شود بے ذوق ز نہار
گہے کودک شود طفلانہ می رقص

(یعنی ہر وقت کی سنجیدگی سے دل بالکل بے ذوق ہو جاتا ہے کبھی بچہ بن کر اچھلا کودا کر)اس ضمن

میں بیدلؔ کا تو ایک شعر ہی کافی ہے۔

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کل شدہ ای بے جنوں مباش

یعنی خرد کی گتھیاں سلجھا لینے کے ساتھ ساتھ کچھ دیوانگی بھی درکار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال نے "اوٹ پٹانگ" کے حوالے سے اردو ادب میں ایک بڑی دلکشا، دانش افروز اور ظرافت مند صنف نثر متعارف کرائی ہے۔

انور مسعود
اسلام آباد
۱۹۔نومبر ۲۰۱۹

ہومرؔ کے چراغِ فکر کا پاسبان، پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

ربِ ذوالجلال کی اس متنوع رنگ کی کائنات میں پاکستان (سرگودہا) سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال یونان کے معروف اور نامور شاعر ہومرؔ کے چراغِ فکر اور عزم واستقلال کی روشن قندیلوں کا ایک تسلسل ہیں۔ وہ سرسیّد احمد خاں کی جدید تعلیم اور لمحۂ موجود کے تناظر میں علم کی شمعیں جلانے والے کارواں کا بھی ایک روشن نمونہ ہیں۔ بچپن میں بصارت سے محرومی نے شیخ محمد اقبال سے بصارت تو لے لی مگر دستِ فطرت نے اُن کے تن بدن اور رگ و پے میں محرومی کی جگہ عزم وعزیمت کی وہ فولادی طاقت بھر دی جس کے بل بوتے پر انھوں نے ایم اے (انگلش) اور ایم اے (اُردو) کرنے کے بعد ایم فل (گولڈ میڈلسٹ) اور پی ایچ ڈی تک کی علمی و تدریسی منزلیں طے کیں اور سرگودہا یونیورسٹی میں تدریسی فرائض سنبھالنے کے علاوہ یونیورسٹی آف پنجاب لاہور میں ریسرچ آفیسر بھی رہے۔ وہ ایک زندہ مثال ہیں اور ہومرؔ کے چراغ کی پاسبانی کا فریضہ اب اپنی اگلی نسل میں منتقل کر رہے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال بنیادی طور پر شاعر ہیں مگر اُن کی نثر کا لہجہ ان کی ادارت میں چھپنے والے ماہنامہ "سفید چھڑی" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ پاکستان ایسوسی ایشن آف بلائنڈ سرگودہا کے صدر بھی ہیں اور قافلۂ بے بصارت کے شرکا میں بصیرت کے بیز زبانے میں مصروف ہیں۔ اُن کی تازہ کتاب "اُوٹ پٹانگ" ان کے انشائیوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی چیدہ تحریریں اور مضامین پڑھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حالات نے ڈاکٹر محمد اقبال سے بصارت تو چھینی مگر اُن کی جھولی میں بصیرت کی نعمت ڈال دی جس نے اُن پر زندگی اور زندگی گزارنے کے سارے راستے آسان کر دیئے۔ اُن کی شاعری میں جس طرح تجربہ اور مشاہدہ

محسوس کیا جا سکتا ہے، اُسی طرح شیخ محمد اقبال صاحب کے انشائیوں میں بھی بھرپور زندگی کے رنگ اور مناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اُن کی ہمتوں اور فکری قوتوں کا اس بات سے اندازہ لگایئے کہ وہ ایک انشایئے "بلا عنوان" میں لکھتے ہیں کہ نثری مضامین میں بہت کچھ لکھنے کے باوجود جانے کیوں کبھی کبھی ایسے لگنے لگتا ہے کہ کہنے کے لیے ابھی بہت کچھ ہے۔ اُن کے انشایئے نامور نقاد ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کی، کی گئی تعریف پر پورا اُترتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں زندگی کو دیکھنے کا ایک دلچسپ مشاہدہ دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کے انشائیوں میں حقیقتِ حیات کے سارے رنگ ہیں مگر انھوں نے زندہ دلی کو اپنی تحریروں اور سطروں میں رنگوں کی طرح بھرا ہے اور کسی طلسماتی قالین پر بیٹھنا اور چراغ رگڑنے کے نتیجے میں حکم کی تعمیل کرنے والے جن کو حاضر پا کر قرّ و فسوں کے کامیاب تجربے کیے ہیں۔

میں پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی شاعری اور ان کے دیگر فکری و تدریسی کارناموں کے بعد اب اُن کے انشائیوں کے تازہ مجموعے پر انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان کی کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید
(پرائڈ آف پرفارمنس)
مینیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد

"اوٹ پٹانگ" میں پنہاں دانشمندی کی باتیں

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کا نام ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، وہ شعری حوالوں سے بھی اتنے ہی جانے پہچانے جاتے ہیں جتنے کہ نثری حوالوں سے۔ ان کی تخلیقی زندگی کے کئی گوشے ہیں، وہ حقیقی معنوں میں ایک دانشور ہیں، ایک ادبی مجلّے کے مدیر اعلیٰ بھی ہیں، ایک بہت اچھے شاعر بھی ہیں، مترجم بھی ہیں، اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی شعراء اور لکھنے والوں کا وسیع مطالعہ کر چکے ہیں۔

اس وسیع اور زرخیز ادبی پس منظر کے ساتھ اگر انہوں نے اپنی تازہ ریزہ خیالی پر مبنی کتاب کا عنوان "اُوٹ پٹانگ" رکھا بھی ہے تو کوئی قاری یا رائٹر اسے ہرگز "اوٹ پٹانگ" نہیں مان سکتا۔ وہ بجا طور پر اسے ڈاکٹر شیخ اقبال کی طویل اور پُر مغز ادبی تحریروں کا تسلسل اور پھیلاؤ ہی سمجھیں گے۔ ان کا ایک شعر ان کے تخلیقی پھیلاؤ کا اظہار یوں کرتا ہے

ابھی باقی ہے خُوئے دل نوازی
جوانی ہے ابھی بوڑھے شجر میں

چنانچہ اس کتاب کو بھی اگر ان کی "خوئے دل نوازی" ہی کی ایک نئی اور انوکھی جہت سمجھ لیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ بہت سے شعراء اچھی غزلیں اور نظمیں کہنے کے باوجود جب ان پیمانوں کو اپنے اظہار کے لیے ناکافی پاتے ہیں تو 'کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے' کے نسخے پر عمل کرتے ہوئے نثری نظمیں لکھنے لگتے ہیں جو تخلیقی لحاظ سے یقیناً ان کی ایک نئی اور زیادہ گہری جہت کا پتہ دیتی ہیں۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی یہ نثری تحریریں اسی زمرے میں آتی ہیں، جس کسی نے بھی ان کی دانشورانہ بلکہ فلسفیانہ نثری تحریریں ان کی کتابوں اور جرائد میں پڑھ رکھی ہیں وہ

ان اوٹ پٹانگ تحریروں کو کتاب کے عنوان کے تحت ہرگز اوٹ پٹانگ نہیں سمجھے گا، بلکہ ان تحریروں کو وہ ان کے اندر موجزن دانشورانہ اور فلسفیانہ افکار کے سمندر کی وسعت پذیری کا ایک نیا اور روشن تر زاویہ محسوس کرے گا، کوئی ذہین قاری ہو یا ادیب یا نقاد، وہ اس کتاب کے عنوان سے ہرگز یہ نہیں مانے گا کہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی تحریر "اُوٹ پٹانگ" بھی ہو سکتی ہے۔

راقم نے جب اس کتاب میں شامل تمام مضامین کا مطالعہ کیا تو مجھے یہ محسوس کر کے خوشی ہوئی کہ اگر چہ یہ تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ مضامین قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں مگر یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ مضامین ڈاکٹر شیخ اقبال کی عمر بھر کی دانش اور مطالعے سے حاصل کردہ سوچوں کا نچوڑ بھی ہیں، اور انہیں دانستہ ایسے ہلکے پھلکے انداز میں تحریر کیا گیا ہے کہ قاری انہیں اسی انداز میں پڑھے اور پھر خود دیکھے اندازِ گل افشانیِ گفتار، کہ کس طرح مشکل سے مشکل معاملات، موضوعات اور مسائل کو بھی اس قدر سلاست اور بے ساختہ انداز کے ساتھ زیبِ قرطاس بنایا جا سکتا ہے اور قاری کس طرح ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی ہمراہی میں ان لفظوں کے اندر چھپی ہوئی دانش اور بصیرت کے چمنستان میں قدم قدم سیرِ گُل کی نشاط حاصل کرتا ہے۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے "اوٹ پٹانگ" کے عنوان سے لکھے گئے ان مضامین پر مشتمل کتاب کے دیباچے یا پیش لفظ کو بھی "بلا عنوان" کا عنوان دیا ہے اور اس میں بھی کچھ ایسا ہی کہا ہے کہ زندگی کے ۷۷ سال مکمل کرنے کے بعد انہیں کبھی کبھی غلط فہمی ہونے لگتی ہے کہ شاید ان کے پاس کہنے کے لئے ابھی بہت کچھ ہے۔ 'غلط فہمی' کا لفظ محض کسرِ نفسی ہی جانیے کہ آگے چل کر وہ بجا طور پر کہتے ہیں:

"مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ اگر کہنے کا کوئی انداز میرے ہاتھ لگ گیا ہے، اور زندگی کو میں نے کچھ نہ کچھ محسوس کیا ہے تو مجھے تا دمِ آخر کہتے رہنا ہے"۔

اسی تسلسل میں وہ اپنی نابینائی کا ذکر بھی کس ہلکے پھلکے انداز میں کرتے ہیں:

"چند احباب کے ہاتھ تو قلم تھامنے سے قاصر ہو جاتے ہیں لیکن الحمدللہ میرا تو یہ مسئلہ

بھی نہیں، مجھے تو کسی کو لکھوانا ہے اور لکھنے والے بدلتے رہتے ہیں اور تازہ دم ہوتے ہیں۔۔۔۔"

جملۂ معترضہ کے طور پر عرض کرتا چلوں کہ لکھنے والے تو تازہ دم ہوتے ہی ہیں مگر لکھوانے والا ان سے کہیں زیادہ تازہ دم ہوتا ہے تبھی اس کے ذہن میں آئے ہوئے خیالات کے ایک سمندر کو سماعت کر کے لکھنے والے تو بدلتے رہتے ہیں مگر لکھوانے والا تو وہی ایک ہے جس کے ذہن کی زرخیزی ایک سے زیادہ لکھنے والوں کو باری باری ڈکٹیٹ کر کے اپنے خیالات و افکار کے بہاؤ کو تحریری شکل میں لا رہی ہوتی ہے۔ اب ذرا یہ دیکھیے کہ اپنے تخلیقی رویے کی اس نئی جہت کو جسے وہ اوٹ پٹانگ کہتے ہیں، سامنے لاتے ہوئے وہ اس کا جواز کس خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں:

"میری خواہش ہے کہ میں مختلف موضوعات پر اپنے خیالات سپردِ قرطاس کروں لیکن کبھی کبھی مجھے لگنے لگتا ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے شاید ڈھنگ سے نہیں کہہ سکا ہوں اس لیے کوشش ہوگی کہ کچھ ڈھنگ سے کہہ لیا جائے، شاید وہ کوئی نیا ڈھنگ ہو لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

اسی تحریر کے اختتام پر ڈاکٹر شیخ اقبال جو فرماتے ہیں وہ تو مزید غور کے قابل ہے، کس قدر سادہ اور بے ساختہ انداز میں کہتے ہیں:

"سنجیدہ بہت ہو لیے، فلسفیانہ باتیں کرنے کا ڈھونگ بہت رچا لیا، کبھی صوفی بنے، کبھی زاہد، کبھی عاشق بنے تو کبھی حسن پرست، لیکن اب ارادہ ہے کہ ذرا احمق بن کر بھی دیکھ لیں۔۔۔۔"

جن باتوں کو وہ "احمقانہ" کہہ رہے ہیں، وہ دراصل ان کی زندگی کے تمام زاویوں اور ان کی تحریروں کے تمام اسالیب کا نچوڑ ہے، ان تمام مضامین میں بس ایک ہی چیز نہیں ملتی اور وہ ہے "اوٹ پٹانگیت" (اس لسانی جسارت یا اختراع کے لیے معذرت) تو جناب ڈاکٹر شیخ اقبال جی، اللہ آپ کو مزید زندگی اور صحت اور تخلیقی وسعت عطا کرے اور آپ اپنے خیالات کو اوٹ

پٹاٹنگ کہہ کر ہی ظاہر کرتے رہیں تاکہ ہم ان سے بہت کچھ سیکھ سکیں کہ یہ دانش و تخیل کا ایک ایسا نمونہ ہے جس کا اردو ادب میں تاحال بہت کم اظہار ہوا ہے۔

آخر میں ان کے بیش قیمت مضامین میں جا بجا جلوہ افروز دانش و حکمت میں سے چند مختصر اقتباسات قارئین کو یہ بتانے کے لیے پیش کر رہا ہوں کہ دیکھیں اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا، کہ بظاہر کوئی بس باتیں ہی کیے جا رہا ہے مگر غور سے سنا جائے تو کوئی دانشمند فلسفی حکمت کے موتی بکھیر رہا ہے، اب یہ پڑھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ ان بظاہر سادہ الفاظ کی گہرائی میں کس قدر راز کر کس قدر تفہیم کر سکتا ہے۔ ان مضامین میں ایک آزادانہ اور فلسفیانہ انداز میں دانش و فکر کا اظہار ہے جو انشائی نثر، ونکاہی انداز کے ساتھ ساتھ اپنے اندر طنز یہ پہلو بھی سموئے ہوئے ہے۔ ان مضامین کے عنوانات بھی قابلِ ذکر ہیں، انگل پچو، حماقتیں، پیار و یار، عشق وشق، شیخیاں شوخیاں، بکواس، ذہنی خرافات وغیرہ، جب آپ ان عنوانات کے تحت مضامین پڑھیں گے تو پھر کچھ نہ پوچھیے۔ ڈاکٹر شیخ اقبال نے آزاد تلازمۂ خیال کو آزاد تو چھوڑا ہے مگر موضوع سے ہٹنے بھی نہیں دیا۔ میرے خیال میں ان تحاریر کو انگریزی زبان کی اصطلاح میں "لاؤڈ تھنکنگ" بھی کہا جا سکتا ہے۔

کسی کتاب میں سے منتخب تحریریں دیباچے میں پیش کرنا ایک روایت ہے تاکہ مصنف کی دانش و حکمت کی کچھ جھلکیاں قاری کو مصنف کی تحریر کا مطالعہ کرنے سے قبل ہی دکھائی دے جائیں۔ جب میں نے اس کتاب میں سے کچھ مختصر اقتباسات منتخب کرنا چاہے تو بڑی مشکل پیش آئی کہ کون سا حصہ چھوڑا جائے اور کون سا منتخب کیا جائے، چنانچہ مزید تلاش کی کوشش کیے بغیر میں بھی ڈاکٹر شیخ اقبال کی طرح ہی اوٹ پٹانگ انداز میں ان کے چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں:

"مارکونی نے ریڈیو کو ایک دن میں نہیں بنا لیا تھا، گراہم بیل ایک ہی میں ہی کامیاب نہیں ہو گیا تھا، رائٹ برادرز جہاز کے موجد فوراً ہی نہیں بن گئے تھے، یہ لوگ دوسروں کے تجربات کو دیکھ کر انگل پچو سے کتنے بڑے لوگ بن گئے، وہ سنا ہے نا ایک سائنس دان ایسا بھی تھا جو ساری

رات انڈے پر بیٹھا رہا اور حیران ہوا اس سے بچہ کیوں نہیں نکلا، اس کا انگل پچو کامیاب نہیں ہوا"۔(انگل پچو)

"۔۔۔بعض بدذوق نقاد تو مزاحیہ شاعری کو سرے سے شاعری ہی نہیں سمجھتے، لیکن اس دردبھری دنیا میں جہاں آنسو ہی آنسو، آہیں ہی آہیں ہوں اگر کوئی ہنسا رہا ہے تو اس کے لیے دعائے خیر کرنی چاہیے۔۔۔"(اوٹ پٹانگ)

"کبھی آپ جوان بننا چاہتے ہیں اور آپ کا جی چاہتا ہے کہ کوئی محبوب آپ کی آغوش میں ہو اور آپ پہ بوسوں کی بارش کر رہی ہو یا اس کا جی چاہے تو چھتر رسید کر رہی ہو۔ یہ بھی کسی انعام واکرام سے کم نہیں ہوتا، اس کی گالیاں سن کر بھی دل بے مزہ نہیں ہوتا۔ اس میں خاص حلاوت ہوتی ہے اور خاص شیرینی۔ اس لیے آپ ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہ سکتے، نہ ہمیشہ عقلمند، نہ ہمیشہ احمق، لیکن کیا کیجیے حماقت کے اپنے ہی مزے ہیں"۔(حماقتیں)

"جانے اس عشق نے کس کس کی زندگیاں حرام کیں، اس کے باوجود عجیب بات یہ ہے کہ ہزاروں کتابیں افسانے، ہزاروں کہانیاں، دیوان کے دیوان، کتب خانے کے کتب خانے، عشق کی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں۔۔۔پر کیا کیجئے ان کا جنہیں کبھی عشق ہوا ہی نہیں، جو پیار سے واقف ہی نہیں، ان کے نزدیک عشق تو محض دیوانے کی بڑ ہے، بے راہ روی ہے، کفر ہے، بڑا کفر، جہنمی ہے عاشق، ہم نے بڑی کوشش کی ہے کہ عشق پر کام کی بات لکھ سکیں، لیکن یقین ہے کہ ہم ایسا نہیں کر پائے ہیں۔ عشق کی ماہیت عشق والے ہی جانیں۔ ہم نے تو کبھی عشق کیا ہی نہیں، قسم لے لیجیے!"(پیار و یار، عشق وشق)

"بدقسمتی سے ہم نے فطرت کے حسن کا گلا دبا دیا ہے، گاؤں کو قبروں میں دفن کر کے شہر آباد کر دیے ہیں، درختوں پھلوں پھولوں کا قتلِ عام کر کے مصنوعی الیکٹرونکس کا سہارا ڈھونڈنے لگے ہیں، مگر ورڈز ورتھ کے دَور میں ایسا نہیں تھا اور ہمارے آبا واجداد کے ادوار میں بھی ایسا نہیں تھا، فطرت کا حسن بڑا دلکش ہوتا تھا، سورج کی روپہلی کرنوں کو دیکھ کر لوگ شاعر بن جاتے تھے،

پھولوں اور کلیوں میں زندگی نظر آتی تھی۔۔۔" (محسن۔۔ظالم۔۔مظلوم)

یہاں میں ان کے کچھ مزید 'اوٹ پٹانگ' اقتباسات لکھنے سے اپنے آپ کو بمشکل روک رہا ہوں، اور اس عنوان کے تحت ان کی دانش اور رہوارِ خیال کی پرواز کے چند نمونے پیش کرنے کے بعد اس یقین کے ساتھ اس مضمون کا اختتام کر رہا ہوں کہ کوئی بھی قاری یہ نمونے دیکھے بغیر بھی ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی یہ 'اوٹ پٹانگ' کتاب ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد مکمل مطالعہ کیے بغیر رکھ نہیں سکے گا، اور مضامین کے عنوانات کے ساتھ ساتھ ان مضامین میں چمکتی ہوئی فکر و دانش کے موتی سمیٹ کر مالا مال اور سرشار ہو جائے گا۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی صحت اور عمرِ طویل کی دعاؤں کے ساتھ یہ دعا بھی ہے کہ ان کا ذہن یونہی اردو ادب کو مالا مال کرتا رہے، آمین۔ وماعلینا الاّ البلاغ۔

نسیم سحر

۱۰ دسمبر ۲۰۱۹ء

"اوٹ پٹانگ" پر ایک نظر

میں نے جب "اوٹ پٹانگ" پر نظر ڈالی تو میری نظر جانے کہاں کہاں پہنچ گئی اس دور پر جب پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال گورنمنٹ کالج سرگودھا میں پڑھاتے تھے اور اس دور پر بھی جب وہ لاہور آئے اور تھوڑی ہی دیر میں لاہوریوں کو یوں لگا کہ جیسے شیخ اقبال بھی لاہوری ہوں۔ ان کے ہاں باقاعدہ محافلِ مشاعرہ اور تنقیدی نشستیں ہوتی رہیں اور وہ لاہور کی کم و بیش ہر علمی اور ادبی محفل میں شرکت کرتے رہے۔

"اوٹ پٹانگ" پر نظر ڈالتے ہوئے مجھے یوں لگا کہ ڈاکٹر اقبال نے ایک نئی دنیا تلاش کی ہے۔ وہ دنیا جو حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ ویسے تو اس دنیا کے باسی اپنے چہروں پر نقاب ڈالے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ڈاکٹر اقبال نے نہایت خوش اسلوبی سے چہروں سے نقاب اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تحریروں میں سنجیدگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے وہ یہاں بھی شاید اپنی تمام کوششوں کے باوجود وہ سنجیدگی سے دامن نہیں چھڑا سکے۔ ان کی کاوش قابلِ صد تحسین ہے کہ انہوں نے اپنی ذات اور اپنے تجربات کے حوالے سے سیدھی سادی زبان میں گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے، مجھے لگتا ہے کہ "اوٹ پٹانگ" کا اسلوب نگارش انشائیے کا سا اسلوب نگارش ہے۔ انشائیوں میں ایک بنیادی خیال ہوتا ہے اور پھر وہ خیال مختلف جہتوں میں پھیلتا چلا جاتا ہے مگر اپنا تعلق اصل سے قائم رکھتا ہے گویا یہ ایک ایسی خوشی ہے جو کسی پھول سے پھوٹتی ہے اور پھر سارے ماحول کو مہکا دیتی ہے۔ انہوں نے انتہائی لطیف پیرائے میں زندگی کی ناہمواریوں کا ذکر کیا ہے اور ہمارے افعال اور اقوال میں جو تضاد ہے اس پر دل کھول کر خامہ فرسائی کی ہے ان کے متنوع تجربات آفاقی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال نے اچھے شعر تو کہے ہی ہیں اور

دل پذیر نثر بھی نذرِ قارئین کی ہے۔ زیرِ نظر تخلیق میں انہوں نے مزاحیہ انداز اختیار کیا ہے، مزاح ہوتا کیا ہے اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے کسی نے کہا کہ جو چیز خلافِ واقعہ ہوتی ہے یعنی

what is out of place and out of time

without danger constitutes humour

کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی کا دل نہ دکھے ہنسی ہنسی میں حقائق پیش کر دیے جائیں بس یہی اس تصنیف کا کمال ہے۔ اس کا عنوان "اوٹ پٹانگ" بذاتِ خود بہت عمدہ ہے ہم سب کبھی کبھی اور کسی نہ کسی طرح "اوٹ پٹانگ" اور انگل پچو ہی سے کام ضرور لیتے رہتے ہیں، ہم مانیں یا نہ مانیں!

میں اس کاوش پر ڈاکٹر اقبال کو دل کی گہرائیوں سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور اُمیدِ واثق ہے کہ وہ مزید اور اس طرح کی تحریریں نذرِ قارئین کریں گے کیونکہ ان کا یہ اسلوب نگارش ان کی شخصیت کے نئے رنگ و آہنگ کو پیش کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر لحظہ نئے طور اور نئی برقِ تجلی کی تلاش میں رہتے ہیں اور نئے جزائر نئی بستیوں اور نت نئی دنیا کی تلاش میں ہمہ وقت سرگرداں نظر آتے ہیں اور اس کی تلاش میں جانے وہ کہاں کہاں کی خاک چھانتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنا رستہ اور منزل نہیں بھولتے۔ عین عافیت کے ساتھ گھر واپس پہنچ جاتے ہیں اور پھر نئی صبح کو نیا کاغذ اور قلم و قرطاس لئے جانے کہاں کہاں جا نکلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ کرے اور وہ یونہی قارئین کو خوشیاں بانٹتے رہیں۔

شاہد بخاری (ایڈووکیٹ)

651/D فیصل ٹاؤن۔ لاہور

03004855148

ابتدائی اُوٹ پٹانگ

زیرِ نظر تحریریں بس ہو گئیں جیسے شعر ہوتے ہیں، غزلیں ہو جاتی ہیں کوئی مصرع ہو جاتا ہے شاخ پر کوئی پھول کھِل جاتا ہے کوئی بلبل نغمہ سرا ہونے لگتی ہے کوئی دل نغمہ بار ہو جاتا ہے، قلم اپنی جولانیاں دکھانے لگتا ہے اور ہمارا شعوری بس بے بس ہو جاتا ہے۔ آپ ان تحریروں پر جو بھی تبصرہ فرمائیں اچھا لگے گا۔ زندگی کے ساتھ ساتھ ہمیں بہت کچھ اچھا لگنے لگتا ہے، ویسے بھی میں اپنی تحریروں پر فتویٰ صادر کرنے والا کون ہوتا ہوں یہ تو قارئین کا استحقاق ہے، ناقدین کا خوشگوار فریضہ ہے (آپ چاہیں تو تلخ کہہ لیں) کہ وہ ان تحریروں پر کیا خیال آرائی کرتے ہیں ویسے یہ تحریریں مجھے لگتا ہے اس رنگ اور ڈھنگ میں نہیں جس میں اس سے قبل کی تحریریں رہی ہیں چلیے چھوڑیے یہ میرا دردِ سر نہیں۔

دنیائے اردو ادب کے قد آور اور ممتاز شاعر محترم انور مسعود صاحب نے جو گراں قدر رائے میری اس ادنیٰ سی کاوش پر دی ہے وہ میرے لئے باعثِ صد افتخار ہے۔ انہوں نے جس خلوص اور محبت سے میری اس کاوش پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔

میں سراپا سپاس ہوں جناب ڈاکٹر انعام الحق جاوید صاحب کا کہ انہوں نے میری ان تحریروں کو درخورِ اعتنا سمجھا اور نہایت حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا۔ لگتا ہے کہ اس طرح کی حوصلہ افزائی سے شاید میری علمی ادبی زندگی کچھ اور دراز ہو جائے۔

میں کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں اپنے پیارے دوست اور ممتاز قد آور شاعر اور دانشور

محترم نسیم سحر صاحب کا کہ انہوں نے نہایت محبت سے میری تحریروں کو پڑھا اور ان پر خوبصورت اور نہایت دلپذیر اور فکر انگیز تبصرہ کیا۔ میں برادر محترم شاہد بخاری صاحب کا شکریہ ادا نہیں کروں گا کیونکہ انہوں نے تو اس خواہش کو اپنی زندگی کا جزولاینفک بنا لیا ہے کہ میرے بارے میں "سب کچھ اچھا ہے تحریر کریں" ویسے شاید میرا خیال غلط ہو اس لئے میں کچھ حروفِ سپاس ان کی نظر بھی کرتا ہوں میں ان احباب کا بھی سپاس گزار ہوں جو ہمیشہ مجھے برداشت کرتے رہے ہیں جن میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، سعید احمد بوٹا، عبدالباسط سہیل، ڈاکٹر احمد حسن، سید نسیم الغنی، پروفیسر شاہد اسلام دانش، ڈاکٹر خالد اقبال، ڈاکٹر شفیق آصف، نسیم اقبال بھٹی، شاکر کنڈان، رانا محمد اقبال، تنویر احمد اور بزمِ فکروخیال اور ماہنامہ سفید چھڑی کے احباب شامل ہیں۔

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال
یکم جنوری 2020

بلاعنوان

جب کہ پندرہ مارچ 2019 کو میں نے اپنی زندگی کے 74 سال مکمل کر لیئے ہیں۔ کبھی کبھی غلط فہمی سی ہونے لگتی ہے کہ شاید میرے پاس کہنے کے لیے ابھی بہت کچھ ہے، اور یہ عجیب بات ہے۔ کہ کبھی کبھی یوں بھی لگنے لگتا ہے کہ اب کہنے کے لیے رہ کیا گیا ہے سینکڑوں کیا ہزاروں اشعار کہہ لیے ہیں ان میں کچھ نہ کچھ تو اہم ہو گا۔

نثری مضامین اور ماہنامہ سفید چھڑی کے اداریوں میں بھی شاید کچھ نہ کچھ کہا ہو لیکن جانے کیوں پھر بھی کبھی کبھی لگتا ہے یا لگنے لگتا ہے کہ کہنے کے لیے بہت کچھ ہے، لہٰذا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوست احباب یہ احساس دلاتے ہیں کہ مجھے ابھی بہت کچھ کہنا ہے اور کہتے رہنا ہے اور مجھے بھی کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ اگر کہنے کا کوئی انداز میرے ہاتھ لگ گیا ہے، اگر زندگی کو میں نے کچھ نہ کچھ محسوس کیا ہے تو مجھے تادمِ آخر کہتے رہنا ہے۔ چند احباب کے ہاتھ تو قلم تھامنے سے قاصر ہو جاتے ہیں لیکن الحمدُ للہ میرا تو یہ مسئلہ بھی نہیں مجھے تو کسی کو لکھوانا ہے اور لکھنے والے بدلتے رہتے ہیں اور تازہ دم ہوتے ہیں۔ اس لئے جو کچھ ضبطِ تحریر میں لانا چاہوں گا وہ آ ہی جائے گا۔ ویسے سوچنے والی بات ہے کہ کیا کسی نے اس زمانے میں کوئی نئی بات کہی ہے جب کہ ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں کتب لکھی جا چکی ہیں، جرائد شائع ہوتے ہیں اور چھپتے رہتے ہیں اور جانے کس کس نام سے اور کس کس صنف کے نام سے تصنیف و تالیف جاری رہتی ہے، خیالات کا اظہار ہوتا رہتا ہے لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ بعض اوقات ہمیں کسی کی بات بہت نئی لگنے لگتی ہے چاہے وہ بات اس سے پہلے کئی بار کہی گئی ہو کہ کہنے والے کا اپنا انداز ہوتا ہے اور یہ کہ وہ یہ بات کس تخصّص سے کہتا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ کچھ باتیں آفاقی بھی ہوتی ہیں بارہا کی گئی ہیں۔ دیکھئے ناں

سورج کب سے نکلتا آرہا ہے ہر صبح کو یوں لگتا ہے کہ جیسے پہلی بار طلوع ہوا ہو، اس کی روپہلی کرنیں اور جانفزا روشنی زندگی کا احساس دلاتی ہے، ہمیں یوں لگتا ہے شاید ہم ایک بار پھر زندہ ہو گئے ہوں، ہر نیا دن، ہر نیا سورج نئی زندگیاں لے کر آتا ہے، نئی تازگی، نئی صباحت، نیا جوش وخروش۔ چودھویں کا چاند جانے کب سے جلوہ فگن ہے پھر بھی اس پر چودھویں کی رات کتنی دلآویز اور دلکش ہوتی ہے۔ مجھے تو ایسی رات اور سورج نکلتے ہوئے دیکھنا کبھی بچپن میں ہی ممکن ہوا تھا، لیکن ایسے احباب کی کمی بھی نہیں جو مدتوں کے بعد سورج نکلتا دیکھتے ہیں یا شاید دیکھتے ہی نہیں۔ وہ اٹھتے ہی اس وقت ہیں جب سورج اپنی تمام روشنی بکھیر چکا ہوتا ہے اور اس کی تازگی ایک حد تک دم توڑ چکی ہوتی ہے، لیکن چلئے صورتحال جو بھی ہو نئے دن کا سورج روزانہ دلکش لگنا بڑی خوشی کی بات ہے۔ پھول کھلتے ہیں، ہاں آپ ہمیشہ پھول دیکھتے آئے ہیں، لیکن ہمیشہ ہر پھول میں آپ کو تازگی محسوس ہوتی ہے، اس میں ایک رنگینی اور ایک پُر کیف منظر نظر آتا ہے، تبھی تو آج بھی لوگ اپنے محبوب کو پھول کہتے ہیں اور کبھی چاند کہتے ہیں اور ہمیشہ کہتے رہے ہیں، اس لیے بات بار بار کہنے کے بعد بھی کہنے کے قابل ہوتی ہے اور کہی جانی چاہئے تا ہم کہنے والے کو یقیناً کئی بار ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے نیا ہے، کم از کم وہ کوئی نئی بات کہنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے اور اگر اس کی بات نئی نہ ہو یا وہ نئے انداز سے نہ کہہ سکے تو پھر بات کی قدر و قیمت کھو کر رہ جاتی ہے، کتب خانے ایسی کتب سے بھرے پڑے ہیں جن میں شاید کچھ بھی نہ کہا گیا ہو محض کہے گئے کو دہرایا گیا ہو اس لیے ان کتب کی زندگی بڑی تھوڑی ہوتی ہے۔ اب مجھے معلوم نہیں اور شاید کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ میں نے اپنی دو درجن کتابوں میں کچھ کہا بھی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ وقت کرتا ہے۔ انگریزی نقاد ڈاکٹر جانسن نے کہا تھا کہ کسی مصنف یا شاعر کے مرنے کے بعد دوسری صدی میں پتہ چلتا ہے کہ وہ مصنف یا شاعر کس قد کاٹھ کا تھا، اپنے زمانے میں ہر کوئی اپنے آپ کو قد آور ہی سمجھتا ہے، یار لوگ اور دوست احباب جس طرح تعریف کے پُل باندھتے ہیں کہ سب کچھ لایعنی نظر آتا ہے۔ اس لیے ہمیں غرض نہیں کہ ہم نے کیا کہا ہے کتنا کہا ہے، اہم کہا یا غیر اہم؟ بس ہمیں کہنے کی عادت

ہو گئی ہے، یہ عادت ایک بار پڑ جائے تو کمبخت چھوٹتی نہیں لاکھ چاہو کہ چھوٹ جائے کبھی نہیں چھوٹے گی چونکہ ہمیں بھی کہنے کی عادت ہو گئی ہے اس سے جان چھڑانا ہمارے بس میں نہیں، اگر آپ کے پاس کوئی نسخہ ہو تو دے دیجیے گا شاید یہ کارگر ہو، لیکن جب تک ایسا نسخہ نہ ملے ہمیں لکھتے ہی رہنا ہے، کہتے ہی رہنا ہے، بولنا زندگی ہے خاموشی موت ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمیں مرنا ہے لیکن ہم مرنا نہیں چاہتے، ہم چاہتے ہیں کہ ہم مرنے کے بعد بھی زندہ رہیں اور کسی نے ہمارے کان میں کہا ہے بلکہ ہم نے پڑھا بھی ہے کہ کتابیں مرنے والوں کو مرنے نہیں دیتیں، زندہ رکھتی ہیں، دیکھئے نہ ہومر کی ”ایلیڈ“ نے ہومر کو اب تک زندہ رکھا ہوا ہے، بے چارے کو مرے ہوئے تین ہزار سال سے زیادہ ہو گئے ہیں اور پھر قبل مسیح کے یونانی ڈرامہ نگاروں کے ڈرامے ہم آج تک پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، میر غالب یا اقبال مرنے کے بعد بھی کچھ اتنا جینے لگے ہیں کہ ہمیں کبھی کبھی احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ ہمیں جینے نہیں دیں گے، یہ تو مرنے کے بعد اور بھی توانا اور تابندہ ہو گئے ہیں۔ ہم ان کے سامنے بڑے چھوٹے قد کے نظر آتے ہیں، بونے سے ”للی پوشین“۔ بہر حال اس میں شک نہیں کتابیں اولاد سے بھی زیادہ مرنے والے کو زندہ رکھتی ہیں، میں نے کچھ درست ہی کہا ہے کہ اولاد تو چند برس تک یاد رکھتی ہو گی، کتنے ہیں جو اپنے والد کے والد کو یاد کرتے ہیں، لیکن یہ کتابیں عجیب ہیں صدیاں گزر جائیں یہ ہمارے ہونے کی منادی کرتی رہتی ہیں، بس اسی لیے خواہش یہ ہے کہ ایک اور کتاب لکھ دی جائے، جس میں کچھ کہنے کی کوشش کی جائے، بہت کچھ نہیں تو کچھ نہ کچھ سہی، شاید کچھ کہتے کہتے ہم کچھ کہہ جائیں اور اگر ہم نے کچھ نہ بھی کہا تو کم از کم ہماری کچھ کہنے کی خواہش تو پوری ہوئی ہے، کسی کی خواہش پوری ہو جائے یہ بھی کم اہم بات نہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں مختلف موضوعات پر اپنے خیالات سپرد قرطاس کروں لیکن کبھی کبھی مجھے لگنے لگتا ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے شاید ڈھنگ سے نہیں کہہ سکا ہوں، اس لیے کوشش ہو گی کہ کچھ ڈھنگ سے کہہ لیا جائے، شاید وہ کوئی نیا ڈھنگ ہو لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کوشش ہی نے زندگی کی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے اگرچہ یہ بات میں کبھی کبھی نہیں مانتا لیکن دنیا

مانتی ہے، یقیناً بڑی تبدیلی آئی ہے اور دنیا عالمی گاؤں بن گئی ہے، میں کسی باب میں عالمی گاؤں پر گفتگو ضرور کروں گا۔ یہ سچ ہے کہ مادی حوالوں سے بہت تبدیلی آئی ہے، بہت آسانیاں ملی ہیں اور ہر میدان میں محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے گئے ہیں، بہر حال اگر ہمارے پاس کوئی بات کرنے کی ہے جسے آپ کام کہیں یا کارنامہ تو وہ کہنے کا جنون ہے، تو ہم اس جنون کو قائم و دائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس بار یہ جنون ''اُوٹ پٹانگ'' کے نام سے نذرِ قارئین ہے کہنے کی کوشش کی جائے گی، سنجیدہ بہت ہو لئے فلسفیانہ باتیں کہنے کا ڈھونگ رچا لیا، کبھی صوفی بنے، کبھی زاہد، کبھی عاشق بنے تو کبھی حسن پرست لیکن اب ارادہ ہے کہ ذرا احمق بن کر بھی دیکھ لیں۔ ویسے تو ہمیں دانائی و دانائی کا کوئی خبط نہیں۔ خواہش ہے کہ اگر بے تکی باتیں ہو سکیں تو کرنے کی کوشش کر لیں کچھ نہیں تو بس ہنسا لیں ویسے ہنسانے والوں کی کوئی کمی ہے نہیں لیکن ہم میں رلانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ آنسو پونچھنے والے کم ہیں، آنسو دینے والے کہیں زیادہ ہیں۔ میری کوشش ہوگی کہ عملاً نہ سہی لفظوں کے ذریعے ہی کچھ نفس ہنسا لیا جائے۔ ڈینگیں ماری جائیں، گپیں ہانک لی جائیں اور کچھ کہنے کی بے ڈھنگی کوشش کر ہی لی جائے اور سب کچھ قارئین کی نظر کر دیا جائے، جیسا بھی ہے جو کچھ بھی ہے۔

☆☆☆☆

انکل پچو

ایک میرا یار ہے آپ چاہیں تو یارِ غار کہہ لیں جس سے میں ہر بے ہودہ، بے تکی اور بے کار بات شیئر کر لیتا ہوں، وہ خوب ہنستا ہے، قہقہے لگاتا ہے اور پھر مجھے یوں لگتا ہے کہ میں نے اس سے اپنی بات شیئر کر کے اچھا ہی کیا ہے۔ وہ اس قدر اتنا ہنستا ہے اور پھر مجھے بھی ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے کیونکہ ہنسی متعدی بیماری ہوتی ہے ایک سے دوسرے کو لگ جاتی ہے اور پھر ساری محفل زعفران زار بن جاتی ہے، اوہو میں تو کچھ اور کہہ رہا تھا۔ وہ جو میرا یار ہے ناں! اس کے پاس میں ایک دن دوڑا دوڑا گیا، میں نے کہا کہ راز پا لیا ہے، راز پا لیا ہے۔ وہ بولا او پاگل کس چیز کا راز، بڑے بڑے کوئی راز نہیں پا سکے تو تُو کس باغ کی مولی ہے، میں نے کہا سن تو سہی، سنے گا تو مزہ آ جائے گا، لوٹ پوٹ ہو جائے گا تو پھر کچھ کہہ بھی چک، کہہ جو کچھ کہتا ہے اس نے کہا۔ دیکھو یہ جو کچھ دیکھتے ہو تم۔ یہ جو کچھ ہمارے اردگرد ہوتا ہے یہ حیرت انگیز کارنامے جو لوگ سر انجام دے رہے ہیں، یہ جو سائنس کی حیرت انگیز ایجادات، ادب و فن کی فتوحات اور تمام روحانی اور مادی کامیابیاں اور کامرانیاں ہیں یہ ''انکل پچو'' کا ہی نتیجہ ہیں۔۔۔ یہ سب ''انکل پچو'' ہے اس سے بہت کچھ معرضِ وجود میں آیا ہے، بے تکی بے ہنگم اور بے ترتیب کوششوں نے معجزات سر انجام دیئے، ہاں ہاں سب کچھ انکل پچو ہے وہ میری طرف دیکھنے لگا۔

بیوقوف یہ سب نتیجہ ہے صدیوں کی دانشوری کا، کاوشوں اور دن رات محنتوں کا، تجربوں کا، ارے یار نہیں ایسا نہیں، سب انکل پچو ہے، انکل پچو ہوتا کیا ہے؟ اس نے کہا، میں نے کہا ایسے ہی بے تکی کوششیں کرتے رہنا، چیزوں کو توڑتے رہنا، تم شاعر ہو، نا، تم نے شاعری کیسے شروع کی تھی بے تکے شعروں سے ایسے قافیہ ملا دیتے تھے جس میں نہ وزن ہوتا تھا اور نہ کوئی ترتیب سب مذاق اڑایا کرتے تھے، پر تم انکل پچو کو استعمال کرتے رہے اور پھر دیکھتے دیکھتے میری طرح

شاعر بن گئے، یہ سب کچھ انکل پچو ہے، جانتے ہو آج کل لوگ ہومیو پیتھی پر بڑا یقین رکھتے ہیں۔ ہینمن MBBS تھا اسے انکل پچو خیال سوجھا اس نے جڑی بوٹیوں پر تجربے کرنے شروع کئے، اسے خود استعمال کرنا شروع کر دیا، جانے اس پر کیا کیا اثرات مرتب ہوتے ہوں گے۔ مرتا مرتا بچا ہوگا، لیکن اس انکل پچو نے اسے دنیا کا بڑا ڈاکٹر بنا دیا، یہ سب کوششیں ایسے ہی شروع ہوتی ہیں، بچے لکیریں کھینچتے ہیں، اُلٹی سیدھی ٹیڑھی اور دیکھتے دیکھتے پینٹر بن جاتے ہیں، بہت بڑے مصور۔ دیکھا نہیں چھوٹے چھوٹے بچے مٹی کے کھلونوں سے کھیلتے ہیں پھر مٹی کے کھلونے بنانا شروع کر دیتے ہیں اور پھر مٹی کے کھلونوں سے جانے آگے کیا کیا کچھ کر گزرتے ہیں، تمہیں یاد نہیں تم اور میں بچپن میں ڈاکٹر اور مریض بنا کرتے تھے تم مریض ہوتے تھے میں ڈاکٹر تھا مجھے یاد ہے وہ بولا، اور یہ بھی یاد ہے کہ تو نے میرے پیٹ میں سوئی چبو دی تھی اور پھر تمھاری پٹائی ہوئی تھی، ہاں یار تبھی تو میں ڈاکٹر بنتا بنتا بچ گیا۔

میری خوش قسمتی یا بدقسمتی سمجھئے، اگر تم میری شکایت نہ کرتے، شاید میں سوئیاں چبھو چبھو کر کتنا بڑا ڈاکٹر بن جاتا اور انکل پچو تجربات سے جانے کتنی ایجادات کر لیتا۔ مارکونی نے ریڈیو کو ایک دن میں نہیں بنا لیا تھا۔ گراہم بیل ایک ہی میں ہی کامیاب نہیں ہو گیا تھا، رائٹ برادرز جہاز کے موجد فوراً ہی نہیں بن گئے تھے یہ لوگ دوسروں کے تجربات کو دیکھ کر انکل پچو سے کتنے بڑے لوگ بن گئے، وہ سنا ہے نا ایک سائنس دان ایسا بھی تھا جو ساری رات انڈے پر بیٹھا رہا اور حیران ہوا اس سے بچہ کیوں نہیں نکلا، اس کا انکل پچو کامیاب نہیں ہوا، دیکھو لوگ کتنی کامیابیاں حاصل کر لیتے ہیں، یہ جو سڑکوں پر دل کا حال بتاتے ہیں یہ انکل پچو کی یونیورسٹی سے پڑھے ہوتے ہیں ان کے پاس انکل پچو کی بڑی بڑی ڈگریاں ہوتی ہیں اور دیکھو لو قسمت کا حال بتانے لگتے ہیں، دولت میں کھیلتے ہیں۔ یہ انکل پچو ہر ایک کے کام آتا ہے، بہت بڑے بڑے پیرو بن جاتے ہیں، بڑے بڑے سجادہ نشین بن جاتے ہیں اور پھر دنیا پر حکمرانی کرتے ہیں، دوست انکل پچو بڑے کام کی چیز ہے، میرا یار میری باتیں سن کر قہقہہ لگاتے ہوئے چل دیا۔ میں سوچتا

چلا گیا، میں نے سوچا کہیں میں نے انکل پچو کا نسخہ غلط تو نہیں پیش کر دیا، نہیں! ایسا نہیں ہمارے سارے شہر میں انکل پچو سے کام لینے والے اپنی روزی روٹی کماتے ہیں۔ بازار جاؤ، کسی الیکٹریشن کو بلا لاؤ، اس کے پاس نہ سند ہوتی ہے، نہ سرٹیفکیٹ، بس انکل پچو کی تربیت حاصل کی ہوتی ہے اور وہ بھی کسی کا احسان لئے بغیر دو چار گھروں میں بجلی فٹ کرتے ہیں تو کچھ سنورتی ہے اور کچھ نہیں سنورتی مگر یہ ماہر الیکٹریشن بن جاتے ہیں، ہمارے چاروں طرف جتنے چھوٹے بڑے کاریگر ہیں، انہوں نے کون سی ڈگریاں حاصل کر لی ہیں مانا کہ اب بڑے ادارے بن گئے ہیں۔ ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ میں بچے پڑھتے تھوڑا ہی ہیں، بس شراتیں کرتے ہیں اور پھر ایسے ادارے جان بچانے کے لئے ایسی ڈگریاں دیئے چلے جاتے ہیں، جان بچانے کی نہ سہی ضرورت کے تحت ہی سہی لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہاں ڈگریاں کیسے ملتی ہیں، یہاں بھی انکل پچو سے کام لیا جاتا ہے اور بڑے بڑے ماہر موجود ہوتے ہیں انکل پچو کے ماہر، یہ آج کل AXACT کا نام بڑا مشہور ہوا ہے، معلوم نہیں یہ یونیورسٹی ہے یا کوئی اور بلا لیکن جانے اس نے کتنے ان پڑھوں کو عالم فاضل بنا دیا ہے۔ کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینئر اس ادارے کا انکل پچو کر رہا ہے۔ سنا ہے کہ اس کے بُرے دن آ گئے ہیں ویسے انکل پچو کے بُرے دن کبھی نہیں آتے۔ ایک در بند سو در کھلے۔ ذہن ہمیشہ انکل پچو سکیموں پر سوچتا رہتا ہے اور بہت سی سکیمیں بے پناہ کامیاب ہوتی ہیں۔ یہ انکل پچو سیاست میں بھی بڑا کام کرتا ہے، بچے تقریریں کرنا شروع کر دیتے ہیں کالجوں میں جب تقریر کا فن آتا ہے تو پھر بیان میں قوت پیدا ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ قوم کا درد بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہ درد بڑا بے درد ہوتا ہے، راتوں کی نیندیں حرام کر دیتا ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ نیندیں آنا شروع ہو جاتی ہیں، قسمت کی دیوی مہربان ہو جاتی ہے، پھر پیسہ ہی پیسہ، طاقت ہی طاقت۔ واہ رے! کیا کہنے! انکل پچو کے، اسی سے سارا جہان ہے، اسی سے ساری ایجادات ہیں۔ اسی کے سارے کرشمے ہیں اور اگر کوئی انکل پچو سے کام نہیں لیتا تو اس کی زندگی میں بڑی مشکلات ہیں۔ دنیا میں ہنر سیکھنے والے کی قدر کرتا کون ہے، سچ مچ عالموں کو پوچھتا کون ہے، پوچھتا ان کو ہے جو انکل پچو سے کامیاب

ہوتے ہیں، یہ انکل بچو فصاحت و بلاغت بھی سکھا دیتا ہے اور عمل کرنا بھی سکھا دیتا ہے، اور جانے کیا کیا کچھ سکھا دیتا ہے، یہ جادو کی چھڑی ہوتا ہے، یہ الہ دین کا چراغ ہوتا ہے، یہ انکل بچو کچھ نہ کچھ ہمیں بھی آ گیا ہے تبھی تو ہمیں باتیں بنانی آ گئیں ہیں جو ہم ہر وقت بناتے رہے ہیں۔

☆☆☆☆

اُوٹ پٹانگ

سچ پوچھئے تو اصل مزہ ہی اُوٹ پٹانگ کا ہے۔ سچی باتیں سن کر تو کان پک گئے ہیں ویسے معلوم نہیں کہ جنہیں ہم سچی باتیں کہتے ہیں سچی ہوتی بھی ہیں یا نہیں لیکن اگر سچی لگنے لگیں تو مزہ کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ کسی نے کہا تھا ناں! ''جو مزہ جھوٹ میں ہے سچ میں کہاں'' سچ میں دلائل تلاش کرنا پڑتے ہیں، کوئی تسلسل تلاش کرنا پڑتا ہے، کبھی کبھی کسی کی گواہی درکار ہوتی ہے۔ بھلا اس مصروف دنیا میں ہم جیسے مصروف لوگوں کے پاس اتنا وقت کہاں کہ ہم ان جھمیلوں میں پڑیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے جو جی میں آئے کہہ دیجئے، اس سے اپنا دل بھی بہلتا ہے اور سننے والے کا بھی، اور کیا چاہیے ''آم کے آم گٹھلیوں کے دام'' ہم پر دھان بھی ٹھہرے کیونکہ ہم نے بڑی بات بتا دی، اور سننے والا بھی خوش ہو گیا۔ جب کسی نے کہا کہ سنا ہے، چوہا شیر کو چُرا کے لے گیا، یار میں نے دیکھا ہے کہ پہاڑ خود چلنے لگ گیا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ آسمان زمین پر اتر آیا ہے، رات ہی رات میں دریا خشک ہو گیا ہے یا کہیں دریا پھوٹ پڑا ہے، دیکھو اُسے مرے ہوئے دس سال ہو گئے ہیں لیکن رات میں نے اسے اپنی دونوں آنکھوں سے دروازے پر کھڑے دیکھا۔ آپ انہیں بھوت پریت کی کہانیاں سمجھیں آپ کی مرضی لیکن ایسی گپ شپ میں اور بے تکی ہانکنے میں بڑا ہی مزہ آتا ہے، جیسے کسی نے کہا کہ میں میٹرک میں اول آیا ہوں اور کسی نے کہا کہ اخبار میں تو کسی اور کا نام لکھا تھا تو اس نے برجستہ کہہ دیا کہ وہ غلطی سے لکھا گیا ہوگا، پھر وہ مسکرا دیا اور کہہ دیا اِس سال نہ سہی اگلے سال پہلی پوزیشن آ جائے گی۔ آخر ایک سال میں دیر ہی کیا ہے ایک سال گزرتے کون سی دیر لگتی ہے، اُوٹ پٹانگ سی ان باتوں میں بلا کی شیرینی ہوتی ہے، بڑی حلاوت ہوتی ہے، بڑا مزہ آتا ہے۔ آپ اسے یا وہ گوئی کہیں آپ کی مرضی۔ ہم آپ کی مرضی میں مخل ہونے والے کون ہیں، وہ ایک بڑے یونانی دانشور نے کہا تھا ویسے ہم بھی کوئی کم بڑے دانشور نہیں لیکن ہم اس کا اعلان نہیں کرتے لوگ جل بُھن جائیں گے، بہر حال اُس دانشور نے کہا تھا

کہ ہنسی اُس بات پر آتی ہے جو بے موقع اور بے محل ہو اور اُس نے مثال دی تھی کہ ایک بہت ہی موٹا تازہ آدمی تیز ہوا میں تیزی تیزی سے چل رہا ہو اور اس کا ہیٹ گر جائے اور اُس کے آگے آگے اڑتا جاتا ہو اور وہ اسے دوڑ کے پکڑنے کی کوشش کرے اور اُس دانشور نے یہ بھی کہا تھا کہ ہنسی خوشی ایسی ہونی چاہئے کہ کسی کا دل نہ دُکھے، کسی کا نقصان نہ ہو بس دل بہل جائے جیسے ہمارے عموماً لطیفوں میں ہوتا ہے۔ بے شمار لطائف بے تُکے بے جوڑ ہوتے ہیں لیکن بڑا مزہ دیتے ہیں۔ جیسے پیرٹی کے لطائف پڑھیئے، ہنستے جائیے، قہقہہ لگاتے جائیے، لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کا ذہن مریض نہ ہو، آپ ہنسنا اور قہقہہ لگانا جانتے ہوں، وہ مضامینِ پطرس ہیں ناں! سب باتیں مبالغے پر مبنی ہیں لیکن یہ مبالغہ چند چھوٹی چھوٹی حقیقتوں سے پھوٹتا ہے۔ اس طرح کے مزاح کو ہم Life Saving Drug بھی کہہ سکتے ہیں لیکن کبھی کبھی اچھے لطائف سے بوریت کا جنازہ نکل جاتا ہے، زندگی پھیکی ہو تو رنگین ہو جاتی ہے، ہر طرف پُھل جھڑیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ ہنسیے اور ہنسائیے اور زندگی بڑھائیے، زندگی سے افسردگی کو بھگائیے، خوشیوں کو گلے لگائیے اور زندگی کو قابلِ برداشت بنائیے۔ دُکھ کی کہانیوں سے اخبار بھرے پڑے ہیں ٹی وی آن ہوتے ہی بریکنگ نیوز کم و بیش موت کے بارے میں شروع ہوتی ہے، جسے سُن کر مر جانے کو جی چاہتا ہے، اس روح فرسا اور جگر کو پارا پارا کر دینے والے ماحول میں اگر ہم دو گھڑی ہنس لیں تو کون سا اصول ٹوٹتا ہے، کون سی قیامت برپا ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں ناں "باقی دیاں گلاں چھڈو۔ دل صاف ہونا چاہیدا اے" مقصد تخریبی نہ ہو ویسے ہمیں اُوٹ پٹانگ کی عادت بچپن میں ہی پڑ گئی تھی۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی ڈرامے سنا کرتے تھے اور پھر ہم خود ہی ڈرامائی گئے تھے ہر وقت بے تُکے مکالمے بولتے رہتے تھے، میں بادشاہ بن جاتا تھا اور وہ وزیر اور پھر گھنٹوں بے تُکے واقعات بیان کرتے تھے، الحفیظ والامان! پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ یاروں دوستوں نے یا پھر خود زندگی نے ایسی گولیاں کھلا دیں کہ مزاح ختم ہو کر رہ گیا اور سنجیدگی نے آلیا۔ میری ساری تحریریں اس امر کی غماز ہیں لیکن مجھے مزاح ہمیشہ اچھا لگا ہے کیونکہ کبھی کبھی ہم بھی اپنی دنیا میں بادشاہ اور وزیر بن جاتے ہیں اور

ہمیں کسی مسخرے کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی وہ مسخرا ہمارے اندر از خود پھوٹتا ہے اور کبھی ہم اُدھار لے لیتے ہیں، مطلق العنانی کا دور تھا، بادشاہ بڑے جابر اور قہار ہوتے تھے، ان کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا تھا، اس لیے وہ چند لمحے خوش ہونے کے لیے مسخروں کی خدمات حاصل کرتے تھے، ان کا کام ہنسنا ہوتا تھا اور کبھی کبھی وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی ہنساتے تھے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے "کینگ لیئر" میں بھی ایک مسخرا ہے، انتہائی تیکھا اور تیز مسخرا، جو لیئر کو اس کی پریشانیوں میں خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے اس کی حماقتیں یاد دلاتا ہے۔ اسی طرح شیکسپیئر کے ڈارمے "میکبتھ" میں بھی ایسا ہی مسخرا موجود ہے اور اس کے ڈرامے "اوتھیلو" میں بھی اور اس کے طربیہ ڈراموں میں تو ہے ہی مسخروں کا راج، وہ ہنستے ہیں اور ہنساتے ہیں، چھتیں پھاڑتے ہیں، زمین کو پاش پاش کر دیتے ہیں، اتنا ہنستے ہیں کہ ماحول زعفران زار بن جاتا ہے لیکن کچھ مزاح ایسا بھی ہوتا ہے جس میں غیر ضروری مبالغہ آرائی، مزاح کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ موجودہ دور میں مزاح کی کوئی کمی نہیں۔ اشعار میں بے ساختہ ہنسی کے وہ فوارے پھوٹ پڑتے ہیں جیسے آپ انور مسعود کو دیکھیں ان کی نظم "اَج کی پکایئے" سنتے جایئے اور سر دھنتے جایئے، اسی طرح ان کی بہت سی نظمیں اور اشعار ہیں، جن میں مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، اس ضمن میں دلاور فگار، ضمیر جعفری، کرنل شفیق الرحمٰن، مشتاق یوسفی اور ڈاکٹر انعام الحق جاوید کا حصہ بھی وافر ہے۔ ابنِ انشاء نے اپنی نثر میں کمال کا مزاح پیدا کیا ہے اور تلاش کرنے سے ہر مزاح نگار میں متعدد جملے اور شاعر میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن کو پڑھ کر ہم ہنسنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بے ساختہ ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے دوست روحی کنجاہی صاحب کی شاعری میں بھی مزاحیہ اشعار کی کمی نہیں انہی کا مصرعہ ہے۔ "حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی"

لیکن بعض بدذوق نقاد تو مزاحیہ شاعری کو سرے سے شاعری ہی نہیں سمجھتے لیکن اس درد بھری دنیا میں جہاں آنسو ہی آنسو، آہیں ہی آہیں ہوں اگر کوئی ہنسا رہا ہے تو اس کے لیے دعائے خیر کرنی چاہیے۔۔۔ ہم نے بھی اس کارِ خیر میں حتی المقدور حصہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

ایک آسیب

آسیب، بھوت پریت، چڑیلیں، بدروحیں، جانے کیا کیا خدائی مخلوق اس دنیا میں آباد کہی جاتی ہے۔ شکر الحمدللہ! ہمیں تو کسی ایسی مخلوق سے واسطہ نہیں پڑا۔ ہاں انسانی شکلوں میں کوئی ایسا واقعہ یا صورتحال ہو گئی ہو تو ہم بتانا نہیں چاہتے خوانخواہ کسی کی دل آزاری ہو گی۔۔۔ لیکن جس آسیب کا ذکر ہم کرنا چاہ رہے ہیں وہ بڑا عجیب وغریب ہے۔ نظر نہیں آتا پر ڈرائے چلے جاتا ہے کبھی ہم اس سے پیار کرتے ہیں، کبھی اس کا نام سن کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کبھی ہماری کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے اور کبھی تمام مشکلوں کی بڑی وجہ۔

اس آسیب سے مراد ہے "انگریزی زبان کا آسیب"، اب آپ ہنس رہے ہوں گے، سچ مچ انگریزی زبان کا آسیب۔ ابھی کچھ دن پہلے میں اپنے طلبا و طالبات کو پڑھا رہا تھا کہ بتاؤ پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے، کسی نے کہا بددیانتی، کسی نے کہا دہشت گردی، کسی کا خیال تھا بیماری، بے علمی، مگر ایک طالب علم نے کہا کہ نہیں سب سے بڑا مسئلہ "انگریزی زبان ہے" ہم سیکھتے سیکھتے تھک ٹوٹ جاتے ہیں، کبھی رٹے لگاتے ہیں، کبھی قسمت آزماتے ہیں، پڑھانے کے لیے اساتذہ کی تلاش کرتے ہیں اور یہ سلسلہ آغازِ تعلیم ہی سے درپیش ہوتا ہے لیکن کم بخت انگریزی آتی ہی نہیں اور کہیں جاتی بھی نہیں۔ انگریزی کے بغیر ہمارے لیے کوئی جائے پناہ بھی نہیں۔ نہ کوئی جماعت پاس ہوتی ہے نہ کوئی نوکری ملتی ہے، نہ افسر بن سکتے ہیں نہ بیرونِ ملک جا سکتے ہیں۔ ہم نے سنا اور ہنس دیئے۔۔۔۔ تم سچ کہتے ہو یہی بہت بڑا مسئلہ ہے جس کو کبھی مسئلہ ہی نہیں سمجھا گیا بلکہ کوشش کی گئی کہ کسی طرح اس سے جان چھوٹ جائے۔ بہت سوں نے اسے نحوست قرار دیا اور بدیشیوں کی دی ہوئی لعنت کہا، بلکہ ہمارے ہاں تو بہت دیر تک انگریزی زبان کی تعلیم کو غیر اسلامی تصور کیا جاتا رہا۔ وہ تو بھلا ہو سر سید احمد خان کا کہ اس نے مسلمانوں کو باور کرایا کہ اگر انگریزی نہ

سیکھو گے تو موجودہ دور میں کچھ بھی نہ کر پاؤ گے اور شاید انہوں نے اپنے انداز میں کہا ہو کہ

"تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں"

دیکھو سنو! دشمن کو مات دینے کے لئے دشمن کے ہتھیار پر قبضہ ضروری ہے اور انگریزی ہی وہ ہتھیار ہے جو دشمن ہمارے خلاف استعمال کرتا ہے لیکن بے چارے سر سید کی بات بہت کم لوگوں کو سمجھ میں آئی، جن کو آ گئی ان کے وارے نیارے ہو گئے۔ انہوں نے مسلم لیگ بنائی اور بلکہ ان میں سے بہت سے پاکستان کے کرتا دھرتا بنے اور بہت سے بن جاتے لیکن وڈیروں اور جاگیرداری کی ریشہ دوانیوں نے ایسا نہیں ہونے دیا، جو کسی نہ کسی طرح قائداعظم کے لشکرِ جرار میں شامل ہو گئے تھے۔ بات کیا تھی اور ہم کہاں نکل آئے۔ بات تو انگریزی کے عفریت کی ہو رہی تھی۔ اگر آپ ہم سے پوچھیں تو ہم کہیں گے کہ اس زبان پر ہم نے ظلم کئے ہیں اور اس نے بھی بہت ظلم ڈھائے ہیں ہم سے ظلم یہ ہوا کہ ہم نے اس کی اہمیت کو جاننے کی کوشش ہی نہیں کی، انگریزی بولنے والے چند جزائر میں رہنے والے دنیا پر کیسے غالب آ گئے جس کی سلطنت پہ کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا مٹھی بھر لوگ لاکھوں پہ غالب آ گئے تھے، مانا اس زبان نے ہی سب کچھ نہیں دیا ہو گا لیکن اس زبان کے بولنے والوں نے یقیناً بہت کچھ دیا ہے۔ لیکن ہم اس زبان کے ہتھیار کو نظر انداز کرتے رہے ابھی ایک سال پہلے کی بات ہے۔ ایک طالب علم میرے پاس آیا اس نے ایم فل کر رکھا تھا۔ لیکن اسے انگریزی کے حروفِ ابجد کے سوا کچھ نہیں آتا تھا نہ کوئی گرامر اور نہ کوئی ذخیرہ الفاظ، کچھ بھی تو نہیں لیکن اس کو لکھنے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ اس نے درسِ نظامی کا نصاب کامیابی سے پاس کر رکھا تھا، اس نے بتایا کہ چند سال پہلے میں نے ایک انگریزی کی کتاب ہاتھ میں پکڑی اور دیکھنے لگا میں ابھی دیکھ ہی نہیں پایا تھا کہ استادِ محترم کی نظر پڑ گئی، "اب تم انگریزی پڑھو گے، کفر سیکھو گے" اس نے مجھے بتایا کہ پھر چند سال بعد جب مدرسوں کو عطیات ملنے لگے اور ان کے نصاب میں کچھ تبدیلیاں آئیں تو محترم اساتذہ کا رویہ بدل سا گیا اور یہی وجہ ہے اب وہاں بھی انگریزی پڑھائی جانے لگی ہے۔ یہ تو رہا رویہ ہمارے سوادِ اعظم کا، عام زندگی میں بھی

عجیب صورتِ حال دیکھنے میں آتی ہے کہ انگریزی کا مضمون پاس کرنا ہر جماعت میں ضروری ٹھہرا رہا۔لیکن اگر کسی نے کہیں اتفاقاً انگریزی کا جملہ بول دیا تو اس پر انگریز کے ذہنی غلام کی پھبتی کسی جانے لگی۔ جہاں ہماری قوم میں بہت سے تضادات ہیں وہاں انگریزی کے بارے میں بھی ہم متضاد رویوں کا شکار ہیں۔ایک طرف تو ہم اپنے بچوں کو انگریزی سکھانا چاہتے ہیں اور دوسری طرف انگریزی سیکھنے کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔بڑے جید عالم و فاضل سٹیج پر انگریزی کے خلاف بول رہے ہوتے ہیں اور ان کے بچے اعلیٰ انگریزی اداروں میں انگریزی سیکھ رہے ہوتے ہیں بلکہ سیکھنے کے لئے سمندر پار بھی چلے جاتے ہیں۔تو پھر کیا ہوا نیت میں فتور نہیں تو اور کیا ہے؟ ہمیں کبھی کبھی سمجھ نہیں آتا کبھی ویسے ہی غصہ آجاتا ہے۔اس طرح ہم سمجھتے ہیں کہ انگریزی زبان سے ہمارا عجیب و غریب رویہ رہا ہے جس نے بہت سی مشکلات کو جنم دیا ہے لیکن اس کے باوجود ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ہم نے جب کسی کو انگریزی کا کوئی جملہ بولتے سن لیا ہماری کیا ہر ایک کی توجہ اس کی طرف ہو گئی اور ہمارے دل میں اس کی توقیر بڑھ گئی "دیکھو وہ انگریزی بولتا ہے بہت پڑھا لکھا ہو گا"۔

کوئی کہہ اٹھتا ہے ویسے انگریزی زبان کے کیا کہنے یہ صدیوں سے دنیا پر حکمرانی کر رہی ہے۔ہم بھی غالباً کوئی ساٹھ سال سے اسے پڑھنے پڑھانے میں محو ہیں لیکن اب بھی کوئی نہ کوئی ایسا لفظ پڑھنے کو مل جاتا ہے، جس کا مطلب ہمیں نہیں آتا،اس لئے مشکلات صرف انگریزی زبان میں نہیں ہیں۔زبان کو سیکھنے کے لئے عمریں درکار ہوتی ہیں۔ہمیں معلوم ہے کہ مستند لغات میں انگریزی کے نو لاکھ الفاظ ہیں اور ہم سعیِ بسیار کے باوجود کوئی دس بارہ ہزار الفاظ سیکھ سکے ہوں گے اور یہی ذخیرہ الفاظ ہمیں اڑائے لیے پھرتا ہے۔لوگ کہتے ہیں ہمیں بڑی انگریزی آتی ہے۔ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں لیکن ہم کسی کو بتاتے نہیں۔کبھی کبھی دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ ہمیں تو انگریزی کے سارے الفاظ آتے ہیں حالانکہ انہیں جو کچھ آتا ہے وہ ہمیں معلوم ہے، ہم کہتے آئے ہیں انگریزی کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے لیکن ہم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ایسا

ضرور ہوا تھا کہ ایک وقت آیا تھا کہ ہمیں لگا تھا کہ اب انگریزی گئی کہ گئی، ہم اس وقت ایک کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے، ہمیں بڑا خوف لاحق ہوا لیکن خوش قسمتی سے ہم نے ایم اے اردو بھی کر رکھا تھا، چلیئے اردو پڑھائیں گے لیکن یہ دور بڑا ہی مختصر رہا تھا۔ایک دور ایسا بھی آیا جب لوگ انگریزی کی بجائے عربی سیکھنے لگے تھے عرب ممالک میں نیا نیا تیل دریافت ہوا تھا ہر کوئی عربی سیکھنے لگا تھا۔مگر اب آہستہ آہستہ صورتحال تبدیل ہو گئی ہے،اب انگریزی کی ایک رقیب چینی زبان ہے یا ہونے والی ہے، ہر یونیورسٹی نے چینی پڑھانا شروع کر دی ہے لیکن ہماری رائے میں صورتحال کچھ بھی ہو انگریزی کا جادو کسی دم درود سے بھاگنے والا نہیں اس پر کوئی منتر کام نہیں کرتا۔دنیا کے نصف سے زیادہ ممالک اسی عفریت کی زد میں ہیں، دنیا کی ساری گفتگو اسی زبان کے ذریعے ہوتی ہے۔حضرات معذرت چاہتا ہوں مجھے پکا معلوم نہیں، کبھی کبھی لگتا ہے اور یہ اس لئے لگتا ہے کہ ہم انگریزی کے ٹیچر جو ٹھہرے اپنے کاروبار کو خراب نہیں کریں گے ہم تو یہی کہیں گے کہ انگریزی پڑھو انگریزی سے یاد آیا کبھی کہتے تھے کہ "پڑھو فارسی بیچو تیل" ہم کہیں گے پڑھو انگریزی بنو افسر، وزیر، سفیر اور جانے کیا کیا کچھ، بہت کچھ ہم سب ایک دم نہیں بتا سکیں گے آج اس پر ہی اکتفا کریں گے۔ویسے ہمارے دوست شاہد بخاری کو یہ وہم ہے کہ اسپرانتو، دنیا کے سب سے زیادہ ممالک میں بولی جانے والی زبان ہے گو، وہ کم تعداد میں ہیں لیکن ہیں ہر ملک میں

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

☆☆☆☆

حماقتیں

عجیب بات ہے کہ کبھی کبھی احمق بننے کو جی چاہتا ہے پر ڈر لگتا ہے کہ لوگ ہمیں بالکل احمق ہی نہ سمجھ بیٹھیں، جو ہماری عزت و آبرو ہے کہیں یہ غارت ہو کر نہ رہ جائے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ خوف کئی بار کم سا ہو جاتا ہے اور ہم حماقتیں کر ہی بیٹھتے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا ناں! کہ کبھی کبھار پاسبانِ عقل کی بھی نہ سنا کریں اور اپنے من کی سنا کریں۔ لیکن بُرا ہو مہذب معاشرے کا جو بعض اوقات بلکہ بسا اوقات ہمیں مہذب بنانے پہ تُلا ہوتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ ہم عالمانہ اور فاضلانہ باتیں ہی کریں گے۔ ٹھیک ہے دفتر میں ایسا ممکن ہے یا اگر آپ معلّم ہیں اور مدرّس ہیں جو اتفاق سے ہم ہیں بھی تو اپنی علمیت جھاڑتے رہیں لیکن پھر بھی یاد رکھیئے کہ آپ کا علم وفضل اکثر و بیشتر سننے والوں کے سر پر سے گزر جاتا ہے اور آپ اس زعم میں مبتلا رہتے ہیں کہ آپ بڑی عالمانہ گفتگو کر رہے ہیں۔ فطرت کا سینہ چاک کر رہے ہیں، زمین سے اس کے راز اگلوا رہے ہیں اور فضاؤں، ہواؤں کو اپنا دستِ نگر بنا رہے ہیں۔ لیکن ہوتا یوں ہے کہ آپ کا علم وفضل کسی کے کام نہیں آتا۔ اوّل تو کسی کو سمجھ ہی نہیں آتا اور اگر کسی کو سمجھ آ بھی جائے تو وہ اسے بےکار اور بےمصرف سمجھتا ہے۔ لیکن پھر بھی سوچیئے کہ انسان کب تک علمیت اور دانائی کا چوغا پہنے رہ سکتا ہے، کئی بار اسے تار تار کرنے کو جی چاہتا ہے اور آپ کر بھی دیتے ہیں، جب آپ کبھی کسی سے عشق و محبت کی گفتگو میں محو ہوں اور آپ کا محبوبِ دل و جاں آپ کے پہلو میں بیٹھا ہو تو ساری عقل، ساری دانائی، علمیت اور علوم و فنون دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اگر آپ نے کبھی اس صورتِ حال سے دوچار دلوں کو گفتگو کرتے دیکھا ہو تو آپ کو لگے گا کہ بےچارہ عاشق نہ فلسفی ہے، نہ حکیم بلکہ ایک عام سا انسان ہے، سادہ سا فرد ہے جو فلسفوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور پیار میں کچھ اس

طرح غلطاں ہوتا ہے کہ اگر کوئی سننے والا ہو تو حیران و ششدر ہو کر رہ جائے۔ سنا ہے غالباً یہ افلاطون کی بات ہے کہ وہ اپنے تخلیے میں گھوڑا بنا ہوا تھا اور اس کی محبوبہ اس پہ سوار تھی۔ ایسے میں اس کے تلامذہ نے اسے دیکھ لیا اور غالباً اسے بھی معلوم ہو گیا تھا۔ کسی موقع پر اس نے کہا سنو! کوئی عالم ہو یا فاضل اس کا کچھ وقت اپنا بھی ہوتا ہے، جو دل سینے میں دھڑک رہا ہوتا ہے اس کی دھڑکنیں کچھ اپنی بھی ہوتی ہیں لیکن برا ہو معاشرے کا کہ اس نے کسی پڑھے لکھے انسان کو روبوٹ سمجھ رکھا ہوتا ہے اور اس کے بارے میں عجیب و غریب تصورات قائم کیے ہوتے ہیں جیسے اس کا دل ہی نہ ہو، اس میں کوئی احساسات ہی نہ ہوں، اس کی آنکھیں آنسو ہی نہ بہاتی ہوں، اس کے ہونٹ خشک ہی نہ ہوتے ہوں، ہو جائے جو ہونا ہے، وہ باؤلی باتیں کر ہی نہیں سکتا۔ کتنی عجیب و غریب اور بےڈھنگی منطق ہے لیکن سنیئے !یاد رکھیے! کسی دانا نے کہا تھا کہ آپ جتنے مرضی پڑھے لکھے ہوں، دانا و بینا ہوں، آپ کو اپنے آپ کو محفل کے حوالے کرنا ہو گا، ماحول کے سامنے گھٹنے ٹیکنے ہوں گے۔ جہاں سب احمق ہوں وہاں عقل مند بننا ویسے بھی احمقانہ عمل ہے۔

کسی اور سیانے نے کہا تھا! اگر آپ گدھوں میں پھنس جائیں تو فوراً ڈھینچوں ڈھینچوں کرنا شروع کر دیں، ورنہ گدھے آپ کو زخمی کر دیں گے۔ وہ کسی نے یوں بھی کہا تھا ناں! اگر تم روم میں ہو تو وہی کچھ کرو جو رومی کرتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ایسے ماحول میں نہ بھی ہوں آپ پاکستان میں ہوں، لاہور میں ہوں یا کراچی میں ہوں تب بھی آپ اپنے کاروبار کا چولا ہی پہنے نہیں رہ سکتے، آپ ایک لباس سے تنگ آ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی آپ کا جی چاہتا ہے کہ آپ بچے بن جائیں، کوئی آپ کو چومے، کوئی چاٹے، کوئی پیار کرے، کوئی جھولے دے۔ کبھی آپ جوان بننا چاہتے ہیں اور آپ کا جی چاہتا ہے کہ کوئی محبوب آپ کی آغوش میں ہو اور آپ پہ بوسوں کی بارش کر رہی ہو یا اس کا جی چاہے تو چھتر رسید کر رہی ہو۔ یہ بھی کسی انعام و اکرام سے کم نہیں ہوتا، اس کی گالیاں سن کر بھی دل بےمزہ نہیں ہوتا۔ اس میں خاص حلاوت ہوتی ہے اور خاص شیرینی۔ اس لیے آپ ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہ سکتے، نہ ہمیشہ عقلمند، نہ ہمیشہ احمق لیکن کیا کیجیے حماقت کے اپنے ہی

مزے ہیں۔

ایک دن میں نے چاہا کہ آج کوئی حماقت نہیں کروں گا آواز آئی یہ تو تمہاری سب سے بڑی حماقت ہوگی، ارے پگلے محض عقلمند بنے رہنے سے عقل ختم ہو جاتی ہے عقل کو بھی سکون چاہیے، راحت چاہیے وہ کہتے ہیں ناں کہ اگر کوئی استاد پڑھا رہا ہو اور ہر پانچ دس منٹ کے بعد کوئی چٹکلا نہ چھوڑے تو وہ استاد ہی نہیں، وہ اپنے لیکچر کو بڑا بورنگ کر دے گا۔ بچے دلچسپی بھی نہیں لیں گے۔ اب تو یہ باقاعدہ طے کر لیا گیا ہے کہ استاد کو اپنا لیکچر لطیفوں اور شعروں سے مزین کرنا چاہیے ورنہ اس کی بات کسی کے دل پر اثر ہی نہیں کرے گی۔ یہ حماقتیں کوئی جان بوجھ کر نہیں کرتا اگر وہ ایسا کر رہا ہو تو وہ حماقتیں مکاری ہوئیں، مصنوعی ہوئیں اور جھوٹ کا پلندہ ہوئیں۔

حماقتیں تو وہ ہیں جو دل سے بے ساختہ پھوٹتی ہیں، ذہن سے اچانک جنم لیتی ہیں۔ اسے ذکاوت کہتے ہیں۔ جانتے ہو ناں ذکاوت یا wit کتنا بڑا عطیہ ہے۔ جو ذکاوت سے متصف اشخاص کو بادشاہ کی قربت میں لے آئی تھی جیسے بیربل کو اور ہزاروں دوسروں کو، اور اگر آپ نے شیکسپیئر کو پڑھ رکھا ہے تو اس میں کمال کے مسخرے ہیں۔ ہوتے وہ مسخرے ہیں مگر وہ بڑی پہنچی ہوئی سرکار ہوتے ہیں دور کی کوڑی لا رہے ہوتے ہیں۔ ان کی حماقتیں بہت سے پندناموں سے کہیں زیادہ اثر انگیز ہوتی ہیں۔ ہماری رائے میں حماقتیں اللہ کا عطیہ ہیں۔ کیونکہ اگر آپ تمام دن سنجیدہ بنے رہیں تو شاید آپ کا فشارِ خون بڑھ جائے بلکہ بڑھ جاتا ہے۔ صاحب اس لیے ہنس لیا کریں، قہقہے لگا لیا کریں اور کبھی جسے پنجابی میں "چوں لیں" کہتے ہیں مار لیا کریں اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے بادشاہ اور شہنشاہ مسخروں کو بڑی عزت دیتے تھے کیونکہ انہی کی وجہ سے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی تھی اور ان کی تیوریاں کم ہو جاتی تھیں۔ بہت سے جاگیرداروں نے بھی ہنسنے ہنسانے کا اہتمام کیا ہوتا ہے لیکن ٹھہریے حماقت کہتے کسے ہیں؟ اس کا کچھ ذکر تو ہم نے کر دیا لیکن کچھ اور کرنا باقی ہے۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ جسے آپ عقل کی بات کہتے ہیں ممکن ہے سو سال بعد اسے

حماقت کہا جانے لگے۔ وہ اپنے بزرگ تھے ناں بڑی عقلمندانہ باتیں کیا کرتے تھے بعض کہتے تھے کہ جب بیل زمین کو ایک سینگ سے اتار کر دوسرے سینگ پر رکھتا ہے تب زلزلہ آتا ہے اور جب آندھیاں چلتی ہیں تو کسی کا قتل ہو رہا ہوتا ہے، جب ہتھیلی میں خارش ہوتی ہے تو دولت آنی ہوتی ہے، کوا بولتا ہے تو کوئی مہمان آ رہا ہوتا ہے اور اس طرح کی ہزاروں عقلمندانہ باتیں ہمارے بعض بزرگ اور بزرگوں کے بزرگ کرتے آئے ہیں لیکن اب ان تمام باتوں کو ہم میں سے بیشتر ان سب مفروضوں کو حماقت سمجھتے ہیں اس کی ضمانت نہیں کہ جو ہم عقلمندانہ باتیں کر رہے ہوتے ہیں انھیں ہمیشہ عقلمندانہ تصور کیا جاتا رہے، شاید انھیں بھی حماقتیں کہہ کر رد کر دیا جائے۔ اس لیے ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ عقلمندانہ اور احمقانہ باتوں میں کوئی حدِ فاصل قائم کی جا سکتی ہے اور ویسے بھی کوئی میری عقلمندانہ بات کو احمقانہ کہہ سکتا ہے اور میں کسی کی احمقانہ بات کو عقلمندانہ سمجھ سکتا ہوں۔ چلیے چھوڑیے کبھی کبھی حماقتیں ضرور کر لیا کیجیے یا اپنے دل و دماغ کو کر لینے دیا کیجیے۔ شاید پھر آپ کو خواب آور گولیاں نہ لینی پڑیں۔

☆☆☆☆

پیار ویار۔۔عشق وشق

جانے کتنی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں، کتنے ہی لوگوں کو جتلائے عشق دیکھا ہےاور جانے کتنے خودبھی عشق کئے ہیں،نہیں نہیں معاف کیجیے!غلطی سے کہہ گیا ہوں اور عشق تو ممکن ہی نہیں،ہم تو ٹھہرے پارسا، پارسااوردانشور بھلا خاک عشق کریں گے۔عشق تو علم ودانش سے کوسوں دور ہے،اس میں کچھ بھی سوچنا نہیں ہوتا۔اس لئے کہتے ہیں کہ عاشق کا دماغ نہیں ہوتا،بس دل ہی دل ہوتااوروہ بھی بھٹکا بھٹکا پھرتا ہے۔کبھی یہاں کبھی وہاں،کبھی ادھر کبھی ادھر،کبھی نیچے کبھی اوپر۔وہ انگریزی شاعر جون ڈن کا دل تھاناں!وہ اسے کہیں رکھ کر شہر بدر ہوگیا تھا،پھر دل دوڑا دوڑا اس کے پیچھے آگیا، یہی حال چچا غالب کا تھااس کا دل نکل کر منڈیروں پر چلا جاتا تھا،یہ تو ہم نے ویسے ہی بزرگوں کا نام لے لیا۔ہاں جو صدیوں پہلے تھے لیکن یہ کم بخت عشق تو جانے کب سے انسانوں کو چمٹا ہوا ہے۔کہتے تو یہ بھی ہیں کہ پہلا قتل بھی نامراد عشق کی وجہ سے ہوا تھا،قابیل کو عشق اپنی بہن سے ہوگیا تھا،وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کسی اور سے شادی ہو،اس لیےاپنے بھائی ہابیل کو قتل کردیا،کہتے ہیں کہ پہلے بھائی بہنوں کی شادی ہوجایا کرتی تھی اگر یہ بات ہی تھی تو پھر تو عشق کو ہمارے خمیر میں ہونا چاہیے تھااور ہے بھی۔عشق کا جنوں،عشق کا پاگل پن،عشق کی دیوانگی،اس کے بڑے قصے ہیں،تاریخ کا سینہ روشن ہے،ناولوں کے دل دھڑکتے ہیں،افسانوں کی روح پھڑکتی ہےاورادب وشعراس کےدم سے زندہ ہیں۔مصوری اسی کا دم بھرتی ہے،عشق نے نہ جانے کیا کیا گل کھلائے ہیں۔اس کے لئے ہزاروں سال تک جنگیں لڑی گئیں،حسیناؤں کے لیے سلطنتیں تباہ ہوگئیں،بڑے بڑے جنگجو سپہ سالار،آمر،جابر،قہاراور ڈھیروں مال ودولت رکھنے والے عشق کے سامنے ڈھیر ہوگئے۔یارلوگ کہتے ہیں خوامخواہ ایک نام رکھ دیا ہے عشق کے سامنے کوئی ڈھیر ہوتا ہے ڈھیر تو حسیناؤں کے سامنے ہوا جاتا ہے۔مہ جبینوں کے سامنے سر از خود جھکنے لگتا

ہے۔سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک محض جنسیت ہے جسے عشق کا نام دے دیا گیا ہے۔

ہم بھی کہتے ہیں یہ جھوٹ ہے،ہم تو صفائی دینے کے لیے تیار ہیں ہم اس پوزیشن میں ہی نہیں کہ کوئی فتویٰ دے سکیں،یہ بھوت تو ہم پر بھی سوار ہوتا ہے،ایسا بھوت جو پیروں فقیروں سے نہیں ڈرتا،ایسا بھوت جس کے سامنے ہر ایک گھٹنے ٹیک دیتا ہے،سارا کچھ یونہی ہوتا ہےاور کبھی کبھی لگتا ہے کہ کسی پر یہ بھوت سوار ہوا تھااور پھر کہیں غائب ہوگیا،ویسےاپنا کان لائیےادھر کیجیے۔سچ بولنے سے ڈرتے ہیں لیکن کم بخت سچ منہ سے نکل ہی جاتا ہے یارلوگ کہتے ہیں کہ یہ عشق اور پیار ویار کبھی نہیں ہوتا یونہی بس دل بہلانے کا انداز ہوتا ہے اسے فلرٹ کرنا کہتے ہیں کسی نے کہا تھا کہ عشق کے مزے وہی لوٹتے ہیں جو فلرٹ کرتے ہیں۔

اصل محبت کرنے والے تو پگھل جاتے ہیں،خاک ہوجاتے ہیں مٹی میں مل جاتے ہیں۔وہ تھی ناں!ایک پنجابی داستانوں میں سسی،وہ تو زمین کا رزق بن گئی تھی،پھر زمین بند ہوگئی تھی،ایک اسی پر ہی کیا موقوف جانے اس عشق نے کتنوں کے گھر اجاڑے،کسی نے زہر کھالیا،کوئی چھت سے کود پڑا،کوئی ٹرین کے آگے کود گیا،کوئی دیواروں سے سر پھوڑ پھوڑ کر مر گیا،کوئی لحہ بہ لحہ مرتا رہا۔مرتا رہااور ختم ہوگیا۔جانے اس عشق نے کس کس کی زندگیاں حرام کیں،اس کے باوجود عجیب بات یہ ہے کہ ہزاروں کتابیں افسانے ہزاروں کہانیاں دیوان کے دیوان،کتب خانے کے کتب خانے،عشق کی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں،اپنا شیکسپیئر تھا ناں!چلو اپنا نہ سہی انگریزوں کا سہی،سولہویں صدی میں تھااس نے بیسیوؤں ایسے ڈرامے لکھ ڈالے جن میں دیکھنے والا دیکھتے ہی حسن کا اسیر ہوجاتا ہےاور پھرایڑیاں رگڑتا ہے،سر پٹختا ہے لیکن شیکسپیئر ان پر بہت مہربان ہوجاتا تھا اس نے تو کہانیوں کا انجام شادی پر کردیا تھااور جوڑے خوش وخرم زندگی گزارنے لگے تھے۔پر شیکسپیئر زندگی کا بڑا نباض تھا،اس نے کیسے یہ ٹھان لیا کہ ہر محبت کرنے والا اپنی محبت پالیتا ہے،مجھےاس پہاڑ جیسے بلند ڈرامہ نگار سے بس یہی گلہ ہے کہ اس نے اپنے طربیہ ڈراموں میں یہی کچھ دکھایا لیکن وہ اتنا غلط بھی نہیں تھا۔کتنے ہیں جنہیں ان کا پیار مل جاتا ہےاور مل

سکتا ہے لیکن برا ہو اس ظالم سماج کا جس نے کبھی دلوں کے ملاپ کو ممکن ہونے ہی نہیں دیا، سماج بھی عجیب ہے اس کے کرتا دھرتا خود رنگ رلیاں مناتے ہیں، راجہ اندر بن کر بیٹھ جاتے ہیں، حسیناؤں کا جھرمٹ ان کے اردگرد ہوتا ہے، جانے کتنی دوشیزائیں ان کی زندگی میں آتی جاتی ہیں، یہ وڈیرے یہ جاگیردار، یہ نودولتیے، یہ سب کچھ ثروت مند ہی تو کرتے ہیں۔ان میں ایسے بھی ہیں جو عشق کی کہانیوں پر سر دھنتے ہیں، پیار کے قصے بڑی رغبت سے سنتے ہیں، ہیر وارث شاہ بہت سوں کو ازبر ہوتی ہے، محبت کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کہی جاتی ہیں لیکن اگر ان کی اپنی بیٹی،ان کی اپنی بہن کسی سے پیار کر بیٹھے تو ان پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے، بلکہ قیامت تو پیار کرنے والوں پر ٹوٹتی ہے گولیاں تیار ہوتی ہیں، خنجر بکف ہو کر یہ لوگ پیار کرنے والوں کو نیست و نابود کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ غیرت بڑی بات ہوتی ہے، یہ عجیب تضاد ہے معاشرے میں،اپنے لئے کچھ، دوسروں کے لیے کچھ،ہم کس راستے پہ چل پڑے ہیں، کیا کہنے لگ گئے ہیں میں نے تو صرف ایک پہلو پر غور کیا ہے اس پہ روشنی ڈالی ہے، یہ ''پیار و یار'' یہ ''عشق و شق'' بڑی بلا ہوتی ہے،اس کی گہرائی سمندروں سے زیادہ، اس کی وسعت صحراؤں سے زیادہ ہے۔یہ آسمان کا سینہ چیر کر بلندیاں سر کرتی ہے، پہاڑ اُس کے سامنے رائی ہیں کوئی پیار کرنے والوں کا راستہ نہیں روک سکتا۔چلیں مان لیتے ہیں کہ اکثر و بیشتر نتائج بھیانک ہوتے ہیں لیکن آپ نے کبھی پیار کیا ہے تو آپ پیار کرنے والوں کے منکر نہیں ہو سکتے۔پیار میں کتنا مزہ ہوتا ہے کتنی شیرینی ہوتی ہے یہ پیار کرنے والوں سے پوچھیے،ان کی محبت روشن تر ہو جاتی ہے، اُن کی راتیں بقۂ نور بن جاتی ہیں پھولوں کے رنگ شوخ ہو جاتے ہیں، ہواؤں میں تازگی آ جاتی ہے، پانی شیریں ہو جاتا ہے۔موسم دلکش اور دل آویز نظر آتے ہیں۔کتنا حسین ہوتا ہے یہ تجربہ محبوب کی ایک جھلک زندگی عطا کرتی ہے، مرنے نہیں دیتی،اِس کے ایک لمس سے سرمستی اور کیف و سرور کے سرچشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔عجیب وجد طاری ہو جاتا ہے اس میں کوئی عجیب ہی کیفیت ہوتی ہے، اگر عاشق سولی پر بھی چڑھ جائے تو رقص کرتا دکھائی دیتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے ساری رنگینیاں، ساری خوشبوئیں، سارے

ذائقے، ساری حلاوتیں، ساری خوش کلامیاں، ساز و آواز کی اور ساری کائنات اس کے اشاروں پر رقص کر رہی ہے۔شرط یہ ہے آپ کسی سے محبت کرتے ہوں، کسی کو ٹوٹ کر چاہتے ہوں تو سب کچھ اچھا لگنے لگتا ہے، مشقت میں مزہ آنے لگتا ہے، مفلس بھی متمول ہو جاتا ہے، جھونپڑی محل بن جاتی ہے، تمام دنیا کی لذتیں میسر آنے لگتی ہیں۔یہ ایک حقیقت ہے اس حقیقت کے ذکر واذکار سے کتب خانے بھرے پڑے ہیں، پر کیا کیجئے ان کا جنھیں کبھی عشق ہوا ہی نہیں جو پیار سے واقف ہی نہیں،اُن کے نزدیک عشق تو محض دیوانے کی بَو ہے، بے راہ روی ہے، کفر ہے زا کفر، جہنمی ہے عاشق، ہم نے بڑی کوشش کی ہے کہ عشق پر کام کی بات لکھ سکیں لیکن یقین ہے کہ ہم ایسا نہیں کر پائے ہیں عشق کی ماہیت عشق والے ہی جانیں۔ہم نے تو کبھی عشق کیا ہی نہیں قسم لے لیجیے!

☆☆☆☆

شیخیاں۔۔۔شوخیاں

یہ شوخیاں ہیں کیا؟ کبھی کبھی لگتا ہے کہ نشے کی گولیاں ہیں جو ہوش اڑا دیتی ہیں مگر سلاتی نہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ انھیں استعمال کرنے والے پر سوتے جاگتے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ ان کے اثر سے کچھ سو رہا ہوتا ہے کچھ جاگ رہا ہوتا ہے اور کبھی کبھی یہ لگتا ہے کہ یہ کوئی ذہنی عارضہ ہے۔ ایڈلر نے یہی کہا تھا کہ "جب کسی انسان کی خواہشات ادھوری رہ جاتی ہیں، فیملی میں اسے با عزت مقام نہیں ملتا کیونکہ اس فیملی میں اتنے بچے ہو جاتے ہیں کہ کسی ایک سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور ایسے بچے کو انگریزی میں Spoilt Child کہتے ہیں یعنی بگڑا ہوا بچہ"۔ یہ بگڑا ہوا بچہ کبھی اپنے آپ کو بگڑا ہوا نہیں سمجھتا اس کے خیال میں وہ بگڑے ہوئے ہوتے ہیں جو اس کی بات نہیں سمجھتے۔ یہ تو کچھ فلسفیانہ گفتگو ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخیوں اور شوخیوں میں بڑا مزا آتا ہے ایک شیخی بگھاریئے مزے لیجیے، لوٹیے، گپ شپ کیجیے، جھوٹ سچ کا آمیزہ تیار کیجیے اور اسے سامعین کی نظر کر دیجیے۔ ہمارا ایک دوست تھا، تھا تو بڑا تنگ دست لیکن دوسروں پر کبھی ایسا ظاہر ہونے نہیں دیتا تھا۔ "یار گھر میں بیسیوں سوٹ پڑے ہیں پر پہننے کو جی ہی نہیں چاہتا"

اگر اسے کھانے کے لیے کوئی کہہ دیتا تو اسے کہہ دیتا

"یار کیا کھلانا چاہتے ہو، گھر میں پتا نہیں کیا کچھ بنا پڑا تھا مختلف کھانوں سے ایک ایک لقمہ لیا، یار ہر ایک چیز کو چکھنا ہوتا ہے ناں چلو جو تم پیش کر رہے ہو وہ بھی کھائے لیتے ہیں، تمہارا دل تو نہیں نہ توڑنا۔ اس دوست کی گفتگو کرتے ہوئے ہمیں وہ طفیلیہ یاد آ جاتا ہے جس کے پاس ایک لیموں ہوتا تھا اور ہر ایک کے کھانے میں اس کو نچوڑ کتا اور کھانا شروع کر دیتا۔ کسی ایک نے تھپڑ رسید کیا تو بولا ہاں میری ماں بھی تھپڑ مار کے کھلایا کرتی تھی ہم اپنے دوست کو طفیلیہ تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کے پاس کوئی لیموں نہیں تھا لیکن پھر بھی لوگ جانے کیوں اسے بہت کچھ پیش کر دیتے

تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں اس کی اصلیت کا پتا نہیں تھا۔ وہ انہیں کہتا تھا یار تمہیں کسی دن گھر لے جاؤں گا اور بہت لذیز لذیز کھانے کھلاؤں گا۔ لیکن وہ دن آیا کبھی نہیں، آتا بھی کیسے اس کے گھر میں اسے مشکل سے کھانا ملتا تھا۔ لیکن اسے چھوڑیئے شیخیاں بگھارنے میں مزا بڑا آتا ہے۔ لوگ بڑی حیرت سے تک رہے ہوتے ہیں جب کوئی بتا رہا ہوتا ہے کہ میرا گھر نہیں بلکہ ایک محل ہے جس میں طرح طرح کی سہولتیں دستیاب ہیں۔ بہت لمبا چوڑا لان ہے اور اسے خوب سجایا گیا ہے۔ اس طرح کی شیخیاں اور شوخیاں دراصل لاشعوری کمزوری کا پتا دیتی ہیں اور کم و بیش ہر شخص اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ دیکھیے ناں، کسی کو سن لیجیے، کہتا ہوا سنائی دے گا وہ میں ہی تھا جس نے سب کچھ کر دیا"۔

"یار دیکھو مجھے کتنی مشکلات بھی آ جائیں میں ہی ہوں جو کسی کی پرواہ نہیں کرتا"۔ اسے نرگسیت بھی کہتے ہیں یعنی اپنے منہ میاں مٹھو بنے رہنا، اپنی ہانکتے رہنا، اپنی کہتے رہنا، ہر بات میں میں، میں کی رٹ۔ میں نہ ہوتا تو جانے کیا کر دیتا، ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنی انا کے گیت گاتے رہتے ہیں، دوسروں پر اپنی بڑائی جتاتے رہتے ہیں۔ ویسے اگر کوئی سچ مچ با صلاحیت ہو دل و دماغ کی تمام قوتیں جیتی جاگتی ہوں تو اپنی تعریف کرنے میں کوئی اتنا حرج بھی نہیں لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ کہنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے صلاحیتیں از خود نظر آ جاتی ہیں۔

وہ کسی دانا نے کہا تھا ناں!

مشک آں است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

خوشبو خود بتا دیتی ہے کہ میں خوشبو ہوں لیکن خوشبو کو کبھی کبھی اپنے آپ پہ شک ہونے لگتا ہے شاید کسی کو متاثر نہیں کر رہی ہوتی اس لیے کہ خوشبو اپنے ہونے کی منادی کرتی رہتی ہے۔ بات ہو رہی تھی شیخیوں کی اور شوخیوں کی، یہ ہمیشہ ڈینگیں نہیں ہوتیں، جھوٹ کا پلندہ نہیں ہوتیں بلکہ کچھ لوگ سچ مچ عظیم ہوتے ہیں اور کبھی اگر وہ اپنی فتوحات کا ذکر کر ہی بیٹھیں تو کیا حرج ہے، لیکن حرج اس وقت واقع ہوتا ہے جب کوئی انسان اپنی انا کے خول میں بند ہو جاتا ہے اور اسے کسی

اور میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی سب اسے بونے نظر آتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو Titan سمجھنے لگتا ہے یہ سمجھ کا فتور ہے یا ماحول کا فتور یا دونوں کا فتور کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن ایک بات ہمیں ہر جگہ نظر آتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو حسین تر دکھانا چاہتے ہیں یہ میک اپ، یہ بناؤ سنگھار بلکہ سولہ سنگھار ہیں کیا؟ یہ بیوٹی پالرز خواہ مخواہ تو نہیں بن گئے؟ یہ شیخیوں اور شوخیوں کے اڈے ہیں۔ یہاں شوخیاں بکتی ہیں اور شوخیاں خریدی جاتی ہیں۔ بڑے مہنگے داموں، دلہنیں بلکہ دولہا بھی انھیں مہنگے داموں خریدتے ہیں تا کہ عروسی جوڑا اچھا لگے۔ اگر کوئی پوچھے کیسی لگ رہی تھی، تو کوئی کہہ دے بجدِ آفتاب، بجدِ مہتاب۔ یہ سنگھار کے اڈے شیخیوں اور شوخیوں کے والدین نہیں تو اور کیا ہیں؟ یہ مشاطگی کیا ہے؟ یہ بناؤ سنگھار کسے کہتے ہیں؟ یہ ایسا جادو ہے جس کے سحر میں سب آجاتے ہیں، کالی دلہن چاند کا ٹکڑا نظر آتی ہے اور کالا دولہا داستانوں کا شہزادہ دکھائی دیتا ہے۔ بعض اوقات ہم شیخیوں اور شوخیوں کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں لیکن سچ پوچھیئے، یہ ایک وبا ہے جو پھیل گئی ہے۔ یا ایک ریت ہے جو چل پڑی ہے، تن ڈھانپنے کے لیے مختصر سا لباس چاہیے لیکن جانے اس کے لیے کیا کیا جتن کیے جاتے ہیں، کپڑے کی بڑی بڑی منعتیں ہیں۔ نت نئے فیشن جنم لیتے ہیں اور قیمتی لباس ہاتھوں ہاتھ بکتا ہے اور اگر ہم اسے شیخی اور شوخی کا نام دیں تو کون ہمیں عقل مند جانے گا۔ ہمیں قنوطی کہیگا، یاسیت پرست قرار دے گا، احساسِ کمتری کا شکار تصور کرے گا اس لیے بابا ہم شیخیوں اور شوخیوں کے خلاف جو کچھ لکھ چکے ہیں اس کے لیے معذرت! ہماری توبہ! کیونکہ ہم بھی تو شیخی خورے ہیں، ہم بھی ڈینگیں مارتے ہیں۔

☆☆☆☆

”میں“

”میں“ بھی ایک عجیب وغریب موضوع ہے، غالباً سارے فسادوں کی جڑ ہے، بڑی ہی فتنہ پرور، لیکن پھر کیا کیجیے ”میں“ ہی سے بات شروع ہوتی ہے اور ”میں“ پر ہی ختم ہوتی ہے اس ”میں“ نے کسی کو فرعون بنا دیا اور کسی کو منصور، ایک دریا میں غرق ہوا اور دوسرا دار پر لٹکایا گیا۔ وہ تو چل بسے لیکن اُن کی ”میں“ نہیں مری۔ سچ مانیے تو ”میں“ ایک آسیب ہے جو ہر ایک کا پیچھا کرتا آیا ہے اور ان کی جان نہیں بخشتا، بسا اوقات جو آسیب زدہ ہو جائے وہ زلزلے اور طوفان برپا کر دیتا ہے اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی اسی لیے تو ”میں“ کو قتل کرنے کے بڑے فتوے جاری ہو گئے ہیں۔ اپنی ”میں“ کو مٹاؤ تب ہی رب تک پہنچو گے۔ اپنی ذات کا انکار کرو، تمہاری ذات کچھ بھی نہیں، تمہاری ”میں“ جھوٹی ”میں“ ہے فریب ہے، دھوکا ہے، وہم ہے، صوفیا کرام نے ”میں“ پر بڑی بڑی یلغاریں کیں بڑی یورشیں کیں، بڑے بڑے لشکر جمع کیے پر یہ سب ”میں“ کو نہ مٹا سکے ”میں“ میں کچھ ایسی قوت ہے، ایسی صلاحیت ہے کہ یہ مرنے سے بھی نہیں مرتی۔ اس کی گردن دباؤ، گلا گھونٹو، اس پر نشتر چلاؤ، لاکھ حملے کرو ”میں“ پھر بھی بچ نکلتی ہے اور کہا اٹھتی ہے

”دیکھو تم مجھے مٹانا چاہتے تھے میں تو مٹ ہی نہیں سکتی، مجھے مٹانے والے مٹ جائیں گے“

کیونکہ یہ ”میں“ کسی ایک فرد کا مسئلہ نہیں یہ تو ہر فرد میں موجود ہے اور کبھی کبھی یہ ”میں“، ”ہم“ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جب ”میں“، ”ہم“ میں بدل جاتی ہے الحفیظ والاماں! قیامت ٹوٹ پڑتی ہے، آسمان شق ہونے لگتا ہے، زلزلے بپا ہوتے ہیں ”ہم بدولت“ میں تبدیل ہو جاتی ہے، ظلِ الٰہی جہاں پناہ میں بدل جاتی ہے اور پھر یہ ”ہم“، ”میں“ کو ہضم کر لیتی ہے۔ ”میں“ اس کا رزق بن جاتی ہے، کوئی فرد فرد نہیں رہتا بس ”ہم“ ہی کی حکومت ہوتی ہے یہ ”ہم“ کبھی سکندرِ اعظم کی صورت میں نمودار ہوتی ہے تو کبھی ہلاکو خان کی شکل میں، کبھی چنگیز خان کی اور

کبھی یہ کبھی قیصر وکسریٰ میں حلول کرجاتی ہے اور عہدِ جدید میں "ہم" کبھی روس کی صورت اختیار کر لیتی تو کبھی امریکا کی۔ ایک زمانہ تھا کہ "میں" ہٹلر میں حلول کرگئی تھی اور وہ کہنے لگا تھا کہ کسی اور کو جینے کی اجازت نہیں، بس جرمن قوم ہی زندگی کی مستحق ہے۔ اس دور میں بڑے شہنشاہ اور بڑے بڑے وڈیرے اس کا شکار ہوگئے، جاگیردار اس کے اسیر ہوئے، اُن کی خواہش رہی کہ وہ ہر "میں" کو لقمہ بنا کر کھائیں کوئی "میں" باقی نہ رہے "ہم ہی ہم" رہیں یہ "ہم" اور اس کی سفاکیاں عالمگیر ہیں، تاریخ بھری پڑی ہے اس کی خون ریزیوں سے، خوں آشامیوں سے اس کو خوش کرنے کے لیے عالمی جنگیں لڑی گئیں۔ سرد جنگ جاری رہی علاقائی جنگیں ہوئیں، انسانیت فرقوں میں تبدیل ہوگئی ذاتوں میں بٹ گئی ملتوں کا روپ دھار لیا، آدم اور حوا کی اولاد پر فرعونیت طاری رہی لہٰذا اس فرعونیت نے ہر ایک پر شب خون مارا بلکہ دن دیہاڑے حملہ آور ہوگئی تو میں بھی اب اپنی "میں" کی بات کر ہی لیتا ہوں، میں کیا لکھوں کس کے بارے لکھوں؟ "ہم" کے بارے میں اور "ہم" پر جانے کتنے قصیدے لکھے گئے ہیں، جانے کتنی مناجاتیں تحریر ہوئی ہیں، ان پر ملی ترانے تحریر ہوئے ہیں لیکن پھر بھی میں کیا کروں؟ میں بھی ایک "میں" ہوں، ایک خبط لاحق ہے۔ وہ خبط یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو زندہ رکھوں، میں کوئی بات کہہ لوں ایسی بات جسے کوئی سننا چاہے، جسے کوئی پڑھنا چاہے لیکن چھوڑیے اب سننے سنانے کے لیے جانے کیا کچھ ایجاد ہوگیا ہے۔ یار لوگ کہتے ہیں کچھ بھی ہو ہر دور میں لفظ کی ضرورت باقی رہے گی، لفظ نہیں مرے گا "کن" بھی ایک لفظ ہے جس نے پوری کائنات کو تخلیق کیا لفظ ایک تلوار بھی ہے، ایک تیر بھی ہے، ایک ایٹم بم بھی ہے، ساری دنیا کو تباہ کرسکتا ہے، صفحۂ ہستی سے مٹا سکتا ہے اور لفظ زندگی بھی عطا کرسکتا ہے، پیار بھی ایک لفظ ہے محبت بھی ایک لفظ ہے کسی سے کہیے تم کتنے پیارے لگتے ہو، وہ مرتے مرتے زندہ ہوجائے گا، "کہیے تم کتنے خوبصورت ہو" شخصیت میں ایک نئی توانائی پیدا ہوجاتی ہے۔ کتنی نئی طاقت بھر جائے گی، اعصاب میں بجلیاں بھر جائیں گی۔ "زندگی" بھی ایک لفظ ہے اور "موت" بھی ایک لفظ ہے اور یہ زندگی ایک لفظ ہی تو ہے 30 سال زندہ رہیے یا 100 سال۔ زندگی موت میں

تبدیل ہوجاتی ہوتی ہے اور یہ لفظ کہ "بے چارہ مر گیا، بہت اچھا تھا" یہ چند الفاظ ہی تو ہیں جو ہونے کو نہ ہونے میں تبدیل کردیتے ہیں۔ "ہے" اور "تھا" میں دوستوں کتنا فرق ہے، ایک لمحہ کا بھی نہیں "وہ ابھی تھا"، "وہ اب نہیں"، "ابھی وہ ہے"، یہ "ہے" اور "تھا"، کے جھمیلے اُف اُف بات کہاں سے کہاں نکل گئی، میں تو "میں" کی بات کرنا چاہتا تھا، گورنمنٹ کالج سرگودہا کے پروفیسر جیلانی اصغر صاحب نے اپنے ایک شعری مجموعے کا نام "میں اور میں" رکھا تھا۔ ہمارے ایک اور دوست صوفی فقیر محمد (مرحوم) بھی، میں اور میں کے الفاظ حرفِ عطف کے بغیر پڑھا کرتے تھے یعنی میں میں سے مجھے یاد آیا وہ جب میں میں کرتا تو یار لوگ کہتے ہیں بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی جب ایک بکرے کی میں میں ختم ہوگی تو ایک اور بکرا میں میں کر رہا ہو گا، کیٹس نے کہا تھا کہ بُلبل لافانی ہے ہم سوچتے تھے لو جب انسان فانی ہے تو بُلبل لافانی کیسے ہو سکتی ہے تب ہمیں اُستادِ محترم نے بتایا کہ یہاں بُلبل سے مراد ایک بُلبل نہیں بلکہ وہ ساری بلبلیں ہیں جواب موجود ہیں اور موجود رہیں گی، جب بُلبل زندہ رہے گی تو "میں میں" کا کیا قصور ہے۔ "میں میں" زندہ رہے گی خواہ وہ بکرے کی "میں میں" ہو یا میری آپ کی "میں میں" ویسے سچ پوچھیے تو "میں میں" میں بڑے مزے ہیں۔

"میں نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوسکتا"

"یہ سب کام میں نے کیا"

"تم میری بات نہیں سنتے"

"میں" کے اتنے نعرے ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔ گھر میں باپ کہتا ہے، "میں ہی سب کچھ کرتا ہوں" گھر میں شوہر کہتا ہے "میں نے سب کچھ کیا ہے"، کسی ادارے کا ہیڈ کسی فیکٹری کا مالک، کسی شہر کا ڈپٹی یا کوئی نام رکھ لیجیے۔ وزیراعظم رکھ دیں، صدر رکھ دیں اور شہنشاہ رکھ دیں سب "میں میں" کرتے نظر آتے ہیں، وہ شخص بھی "میں میں" کرتا ہے جس کے تن پر تا نہیں ہوتا سر پر چھت نہیں ہوتی، ایک وقت کی روٹی کھاتا ہے پر اُس کی "میں" بڑی فولادی ہوتی ہے،

ذرا کسی ایسے دوست کو کچھ کہہ کے دیکھئے آپ کی ایسی کی تیسی کر دے گا۔ہاں! تعلیم "میں" کی بڑی دشمن ہے تعلیم یافتہ آدمی کی "میں" قدرے کمزور ہو جاتی ہے لیکن ختم نہیں ہوتی، وہ بھی کسی نہ کسی انداز سے اس کا اثبات کرتا رہتا ہے، ہاں میں کے اثبات سے علامہ اقبال یاد آ گئے جنہوں نے خودی کو نئے معانی عطا کیے، یہ کہا کہ خودی یعنی "میں" ہی سب کچھ ہے، جو خودی رہی تو شاہی نہ رہی" تو خودروسیاہی کون کروائے گا۔کم ازکم میں تو نہیں کرواؤں گا آپ بھی نہیں۔بس پھر خودی کا نقارہ بجائیں پھر کارخانے میں طوطی کی ہر کوئی سنے گا۔علامہ اقبال نے "میں" کو خودی کا پیکر عطا کیا اور کہا کہ اس "میں" یعنی "خودی" کی حفاظت کرو تو رب سے مل جاؤ گے، رب کے ساتھ تخلیقی عمل میں شامل ہو جاؤ گے، چلیئے چھوڑیئے! یہ بڑا بورنگ موضوع ہو جائے گا لیکن یہ سچ ہے کہ وجودیت کی طرح اقبال نے بھی "میں" ہی کے موضوع پر زور دیا "میں" کا علم بلند کیا، جو جانے کب تک بلند رہے گا، شاید ہمیشہ بلند رہے گا، علامہ اقبال چل بسے تھے، جانے کتنے اقبال چل بسیں گے، "میں" زندہ رہے گی، پائندہ رہے گی، مٹے گی پھر بھی نہیں ہرگز نہیں، "میں" زندہ رہے گی۔

☆☆☆☆☆

بکواس

میں نے اپنے ایک دوست جو کہ "بکواس" کے نام سے مشہور رہے سے کہا یار میں "بکواس" پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں، بولا پھر "بکواس" ہی لکھو گے ناں! اور کیا لکھو گے، میں نے کہا بھولے بادشاہ لوگ بکواس ہی کو پسند کرتے ہیں۔اگر کوئی لکھاری کوئی عقل کی بات لکھنے لگے تو مشکل ہو جاتی ہے، عقل کی بات اور دلیل کی بات یہاں سنتا کون ہے! چ کے رسیا اپنی زندگی کے دشمن اول ہوتے ہیں اس لیے دوست "روم میں وہی کچھ کیجئے جو اہلِ روما کرتے ہیں" تم نے سنا نہیں کہ جہاں سب احمق ہوں وہاں عقل مند بن کر رہنا سب سے بڑی حماقت تصور کی جاتی ہے تو اس لیے میں نے اپنا موضوع "بکواس" چنا ہے۔ویسے سچ پوچھیے تو ہم زندگی میں زیادہ بکواس ہی کرتے ہیں۔میں نے ایک طالب علم سے کہا "ٹوم جونز" پڑھو یہ فیلڈنگز کا ناول ہے جو اٹھارویں صدی میں لکھا گیا کئی دنوں بعد ملا اور کہنے لگا یہ آپ نے کیا بکواس ناول پڑھنے کے لیے کہہ دیا تھا۔میں نے اُسے ڈانٹا سنو! یہ تو انگریزی کا بہت بڑا ناول ہے تمہیں سمجھ نہیں آیا۔"نہیں سر نہیں نری بکواس ہے۔وہ جو ایک حرامزادہ ہے اس کو ہیرو بنا دیا گیا اور جو شریف زادہ ہے اسے ذلیل و خوار کیا گیا ہے۔بھلا یہ کیا ادب ہے بکواس ہے سب نری بکواس"۔میں ہنس پڑا چپ ہو گیا۔میں نے سوچا بچہ ہے بڑا ہو جائے گا تو بکواس میں عقل تلاش کرنے لگے گا، بہت سوں کو تو شیکسپیئر کے ڈرامے بھی بکواس لگتے ہیں، شاید اس لیے کہ وہ ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتے یا اس لیے کہ وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔اچھا چھوڑیئے! اس موضوع پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، بہت بکواس کی جا سکتی ہے۔سوچئے ناں! میرا ایک دوست تھا اتنی محنت سے اس نے پڑھائی کی۔دن میں پڑھتا رات کو پڑھتا گھر کا کام بھی کرتا تھا۔ایم اے کر گیا اور کچھ یوں ہوا کہ نوکری بھی مل گئی، بڑا خوش ہوا اور چند مہینے بعد ملا اور کہنے لگا یار نوکری کیا ہے؟ نری بکواس ہے، بوس جینے ہی نہیں دیتا، ہر بات پر

ڈانٹتا ہے۔ کیا میں نے اس لیے پڑھا تھا کہ ڈانٹ کھائے جاؤں اور بے وجہ ڈانٹ کھاتا جاؤں۔ وہ کہتا کہ میں سچ بولتا ہوں اور تم سچ سن نہیں سکتے۔ بھلا سوچو اگر میں سچ بولوں تو کیا وہ سن سکے گا نہیں! نری بکواس ہے نوکری۔

کوئی ہندوستانی فلم تھی اس پر کروڑوں روپے خرچ کیے گئے تھے، میں اور میرا دوست فلم دیکھنے گئے اُسے پسند نہیں آئی اس نے کہا کہ ''کیا بکواس ہے اس میں کچھ رومانی مکالمے ہیں، دو چار بے ڈھنگے نغمے ہیں ہیرو اور ہیروئین کا ملاپ ہے اور کیا ہے، یار ہم نے تین گھنٹے ضائع کیے''

وہ بولا۔ ''اچھا! یہ بکواس کا لفظ بڑا عجیب و غریب ہے جو چیز سمجھ نہ آئے وہ بکواس ہے اور کبھی کبھی جو سمجھ آجاتا ہے وہ بھی بکواس ہی لگتا ہے''

میرے پاس فلسفے کی کتاب تھی میں بڑے انہماک سے پڑھ رہا تھا ایک دوست آیا

''کیا پڑھ رہے ہو''

''بہت عمدہ فلسفے کی کتاب ہے'' میں نے کہا۔

وہ بولا ''سب بکواس، نری بے کار۔ تم نے وہ بیل کی کہانی سن رکھی ہے ناں! بیل کے مالک نے بیل کے گلے میں گھنٹی ڈال رکھی تھی کہ وہ اگر چلتا ہوا رک گیا تو گھنٹی نہیں بجے گی اور مجھے معلوم ہو جائے گا کسی نے کہا کہ اگر وہ کھڑا کھڑا گھنٹی بجانے لگ گیا تو۔ وہ بولا وہ بیل ہے فلسفی نہیں'' اسے کسی کا قول یاد آیا کہ پڑھا لکھا شخص وہ ہوتا ہے جو مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر فلسفی مسائل کے حل کو مسئلہ بنا کر پیش کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

تاریخ کی کتاب اُٹھا لیجیے، کہنے والے کہتے ہیں یار تاریخ تو بس تاریخ ہوتی ہے۔ جنگوں اور رومان کے قصے ہیں اور دھرا کیا ہے اس میں؟ سب بکواس ہوتی ہے۔ تاریخ میں کچھ سچ نہیں ہوتا کسی دانشور نے کہا تھا کہ جس جھوٹ پر سب کا اتفاق ہو جائے گا وہ تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے اور تاریخ کہلواتا ہے۔ ویسے سچ تو یہی ہے کہ زندگی میں بکواس کا لفظ بہت عام ہو گیا ہے، تکیہ کلام نظر آتا ہے اور میں سوچنے لگا ہوں کہ اس میں کچھ سچائی بھی ہو گی، کبھی کبھی مجھے بھی زندگی

عجیب و غریب لگنے لگتی ہے، پیدا ہوئے، پڑھا، شادی کی، بچے ہوئے اور مر گئے۔ کیا نمایاں کام کیا، کون سی نئی بات کی، بس وہ ہی گھسا پٹا اسلوبِ حیات۔ سچ مچ یہ سارا عمل بکواس ہی بکواس لگنے لگتا ہے۔ کئی دفعہ تو ساری شاعری ہی بکواس لگنے لگتی ہے لغو لگنے لگتی ہے، لایعنی اور بے معنی لگنے لگتی ہے اور کبھی موسیقی، کبھی شوہر بکواس لگتا ہے کبھی بیوی۔

ہاں! میں سمجھتا ہوں کبھی کبھی ''بکواس'' ضروری بھی ہوتی ہے اگر ہم ہمیشہ عقل کی باتیں کرتے رہیں، دانش کا تڑکا لگاتے رہیں، افلاطون کے پڑپوتے اور سگو پوتے بنے رہیں تب بھی کیا مزہ آئے گا۔ کبھی کبھی دل کو اپنے آپ تنہا بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ ہمارے ایک استادِ محترم تھے کسی نوجوان سی لڑکی کے ساتھ گھوم رہے تھے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ان کی رشتے دار ہو لیکن ہم لوگوں نے قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔ اگلے دن ان سے ملاقات ہوئی اور ہماری ہنسی چھوٹ گئی سارا واقعہ بیاں کیا وہ بولے ''عزیزو میں کوئی پتھر نہیں انسان ہوں، ویسے گدھوو تو میری بیٹی تھی''۔ علامہ اقبال نے بھی تو یہی کچھ کہا ہے ناں!

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ہاں ہاں! دل کو تنہا بھی چھوڑ دینا چاہیے تبھی بات بنتی ہے بڑے سے بڑا عالم دانشور مفتی اکثر و بیشتر دل کو تنہا چھوڑ دیتا ہے، ہٹلر بھی ایوا براؤن پر مرتا تھا، اتاترک بھی کسی حسن کا نشانہ بنا تھا اور ہمارے قائد اعظم بھی کسی کے سحر میں آ گئے تھے۔ اگر یہ سب لوگ اس حماقت کا شکار نہ ہوتے تو وقت سے پہلے گزر گئے ہوتے، مر گئے ہوتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ لوگ بوڑھے ہو کر بھی بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں، بچہ بن جاتے ہیں، بچوں کی سی آواز نکالتے ہیں اور تنہائی میں وہ سارے کام سرانجام دیتے ہیں جنہیں آپ چاہیں تو بکواس کی ذیل میں لا سکتے ہیں، بس ہماری رائے یہ ہے، ہاں یہ رائے بھی بکواس ہو سکتی ہے۔ عقل کی باتیں ہونی چاہئیں اور بے عقلی کی بھی، کبھی آنسو آئیں تو رو لینا چاہیے، کوئی موقع ہاتھ آئے تو قہقہے بھی لگا لینے چاہئیں اور اگر کہیں نظر اُٹھ جائے تو

اٹھ جانا بھی نظر کا حق ہے۔

نظر آخر نظر ہے، بے ارادہ اٹھ گئی ہوگی

اگر دل کسی پر آجائے تو آجائے "دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت" تو کیا اسے پھانسی پر چڑھا دیں، اس پر بھی فتویٰ صادر کردیں، پھر تو مر ہی جائے گا بے چارہ اور ہمیں بھی لے ڈوبے گا، اس لیے عقل اور بیوقوفی لازم و ملزوم ہیں۔ دانشوری اور حماقتیں دونوں زندگی کا لازمی حصہ ہیں، ہم نے کوئی دانش کا پیکر نہیں دیکھا جس سے کبھی بھول چوک نہ ہوئی ہو یا کسی نے کبھی بکواس نہ کی ہو۔ یہ بہت ضروری ہے، صحت کے لیے ضروری، بڑا تیر بہدف نسخہ ہے لمبی عمر پانے کا۔ کبھی کبھی بولتے جایئے، بے کار بولتے جایئے، بے مقصد بولتے جایئے، ہاں ہاں! ہم نے کبھی کبھی کہا ہمہ وقت نہیں۔

ہماری رائے میں "بکواس" یا بے ہودگی کوئی اتنی بُری بات نہیں ویسے بھی ہماری تمام اقدار اضافی ہی ہیں، کئی دفعہ ہمیں کسی کی بکواس اتنی اچھی لگتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ بے تکی سنتے رہیں، سر دھنتے رہیں، اس میں کھوتے رہیں، اگر اس بات پر شک ہو تو کسی کلب میں جا کر دیکھ لیجیے اگر ممکن ہو تو کسی کو اپنے محبوب سے باتیں کرتے سن لیجیے، کبھی میاں بیوی کی گفتگو سن لیجیے۔ بس اتنی ہی بکواس کافی ہے شاید زیادہ بکواس میں کر بھی نہ سکوں اور آپ بھی نہ سن سکیں۔

☆☆☆☆

جوانی

اس دیوانی اور مستانی جوانی پر کچھ کہنے سے پہلے مجھے ایک معذرت کرنی ہے وہ یہ کہ مجھے اس دھڑکتے پھڑکتے چیختے پکارتے ناچتے کودتے موضوع پر کوئی چالیس پینتالیس سال پہلے لکھنا چاہیے تھا کیونکہ شاید اب تو کچھ ایسی یادیں ماند پڑ گئی ہوں لیکن انہیں ماند نہیں پڑنا چاہیے تھا او وانہیں میں نے بھری بزمِ میں راز کی بات کہہ دی۔ ایسا نہیں ہے۔ کون کہتا ہے کہ مجھ جیسے جوان کے ولولے، طنطنے، قہقہے، مشغلے محو ہو گئے ہیں۔ وہ ہمارے حفیظ جالندھری تھے ناں! وہ جانے کب تک کہتے رہے۔

"ابھی تو میں جوان ہوں" ویسے کہتے بھی سچ تھے، وہ جوان تو تھے اگر جوان نہ ہوتے تو جوان شعر کیسے کہہ لیتے اگر اسی دلیل کو مان لیا جائے تو جوان شعر کہنے والا جوان ہی ہو سکتا ہے تو پھر ہم جوان ہی نہیں بلکہ نوجوان ہیں، جب میں اپنے آپ کو نوجوان کہتا ہوں تو میرے بچے "نا جوان" کہہ اٹھتے ہیں تو میں تالی بجا دیتا ہوں۔ ان کو کیا خبر جوانی تو حوصلے، ولولے، رجائیت اور جوش و خروش کا نام ہے اور وہ اللہ کے فضل سے مجھ میں موجود ہے۔ ہاں ہاں میرے کتنے قارئین اس کی تصدیق کرتے ہیں میرے شعروں میں وہی جوانی دھڑکتی ہے، وہی کہانی موجود ہے جو سلگتے دہکتے دَور میں ہوا کرتی ہے۔ چھوڑیئے! ہم کسی بحث میں نہیں پڑتے مجھے بحث سے ویسے ہی الرجی ہے، بُرے لگتے ہیں وہ لوگ جو خوامخواہ بات سے بات نکالتے ہیں، دلیل سے دلیل کشید کرتے ہیں اگر ہم دلیلوں پہ آگئے تو ہمارا اپنا وجود خطرے میں پڑ جائے گا، چھوڑیئے! ان خرافات کی بات کرتے ہیں جو جوانی کی بہار میں جلوہ فگن ہوتی ہیں مان لیجیے ناں! اور ہمارا دل بھی مانتا ہے کہ جوانی کے گلشن و گلزار بڑے روح پرور اور جاں نواز ہوتے ہیں، جاں نواز جوانی کے کیا کہنے، مضبوط اعصاب، مضبوط ارادے، مضبوط قہقہے اور کبھی کبھی مضبوط آنسو ہاں تو مضبوط کہنے میں کیا

حرج ہے خوانخواہ زبان کی قید میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔اگر ہماری بات کسی کی سمجھ میں آتی ہے تو ٹھیک !یہ بات چھوڑیئے یہ ناقدین کا کام ہے جو بال کی کھال اُتارتے ہیں اور خود کم سے کم تخلیقی کام کرتے ہیں۔تو میں کہہ رہا تھا معلوم نہیں کہتے کہتے خیال ادھر اُدھر کیوں ہو جاتا ہے، چلئے چھوڑیئے جوانی کیا عمدہ دور ہوتا ہے، زندگی کے بہترین دور میں جانے کیا کیا خواہشیں دل میں انگڑائیاں لیتی ہیں، رقص کرتی ہیں اور دھمال ڈالتی ہیں اور دامنِ دل ان کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ کیا کیا ادائیں ہوتی ہیں جو رات کی نیندیں اڑا دیتی ہیں اور دن کا سکون کہیں رفو چکر ہو جاتا ہے۔ پر اس بے سکونی بے اطمینانی میں کتنا مزہ ہوتا ہے، کتنی لذت ہوتی ہے اس پریشان حالی میں، ہمیں بھی یاد ہے، بہت کچھ یاد ہے، بہت کچھ کہنا چاہا پر کہہ نہیں پائے، بین السطور کہا، بہت کچھ کہا۔ ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ ہم جوانی کو محسوس کر سکتے ہیں چھو نہیں سکتے، ٹھوس صورت میں بیان نہیں کر سکتے، نہیں !ایسا بھی نہیں یہ حسین شکلیں، یہ حسین چہرے، یہ مہ جبین، مہوش، ماہ پارے دیکھیے لفظوں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ جوانی خود بول اُٹھے گی بس جوانی کی جوانی ہی دلیل ہے، یہی جوانی ہے، کیا ہوتی ہے دلکش جوانی ہے، شانِ بے نیازی، ادائے کافرانہ، غمزہ و عشوہ، مسکراہٹوں میں بجلی، زلفوں میں مقناطیسیت، رخساروں میں جنت، ہونٹوں میں مے خانے، بھلا کون کافر ہے جو اپنا ایمان برقرار رکھ سکے گا۔ یہ ہے جوانی، نہیں صرف یہی نہیں، بڑی چنچل شے ہوتی ہے جوانی، ہر پل اٹھکیلیاں کو جی چاہتا ہے۔تھرکنے، چہکنے، مٹکنے کو جی چاہتا ہے، کتنے پاؤں رقص کرنے لگتے ہیں، ہاتھ اپنی جولانیاں دکھانے لگتے ہیں کوئی کام مشکل نظر نہیں آتا۔

"دیکھا میں سب کچھ کر گزروں گا"۔

"یہ بھی کوئی کام ہے میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"۔۔۔ہم پہاڑ سے جوئے شیر نکال دیں گے۔ کشمیر کو پل بھر میں فتح کر لیں گے۔۔۔ساری دنیا کو مومن بنا دیں گے۔۔۔علم کے چراغ روشن کر دیں گے۔۔۔۔ پہاڑوں میں سے رستے نکال لیں گے۔۔۔۔دریاؤں کا رخ موڑ دیں گے۔۔۔۔ستاروں کو نوچ لیں گے اور نوچ کر اس کی مانگ میں بھر دیں گے۔۔۔یہ آسمان چیز ہی

کیا ہے۔۔۔ہم بے بال و پر اڑ کر وہاں چلے جائیں گے۔۔۔یہ کر دیں گے وہ کر دیں گے۔۔۔۔ دیکھنا تو سہی کیا کیا کر دیں گے۔۔۔

یہ بلا کا جوش ہوتا ہے، اس دور میں جوان اپنے آپ کو پہاڑوں سے زیادہ مضبوط، سمندروں سے زیادہ گہرا، پھولوں سے زیادہ حسین اور پرستان کا باسی تصور کرنے لگتا ہے۔لیکن رکیئے۔۔۔رکیئے۔۔۔یہ تو ایک پہلو ہے ایک اور پہلو بھی ہے جس کی طرف کچھ اشارے تو ہوتے آئے ہیں وہ پہلو ہے بے قراری کا، بے تابی کا، بے چینی کا اور سیمابیت کا۔ جوانی میں یوں لگتا ہے یا لگنے لگتا ہے جیسا کہ سارا معاشرہ ہی ہمارے خلاف ہے، ظالم سماج جینے نہیں دیتا اور جیسے دل ہے کہ کھیلن کو چاند مانگتا ہے مگر کوئی ایسا کرنے نہیں دیتا اور یوں بعض اوقات زندگی پیاری سی زندگی، سونی سی، سندری زندگی موت کی آغوش میں چلی جاتی ہے، زندگی خود زندگی کا گلا کاٹ دیتی ہے، موت غالب آجاتی ہے، جوانی خاک میں مل جاتی ہے لیکن اگر جذبے کے ساتھ ساتھ کہیں عقل بھی ہاتھ لگ جائے، کوئی رہنما، کوئی رہبر، کوئی ساتھی، کوئی اچھا ہم سفر مل جائے تو یاسیت اور قنوطیت کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔زندگی میں پھر توانائی آجاتی ہے، قوت آجاتی ہے، آپ دیکھتے نہیں کیا!

ہر سیاسی جماعت، ہر مذہبی گروہ، ہر دہشت گرد جوانوں کی طرف دیکھتا ہے، اگر کوئی انقلاب لانا ہو تو جوان چاہئیں، اگر کوئی تخریبی کام سرانجام دینا ہو تو جوانوں کی خدمات درکار ہوتی ہیں، اگر دشمن سے پنجہ آزما ہونا ہو تو جوان۔لیکن بدقسمتی سے جوانی کا استحصال بہت ہوا ہے یا یوں کہیں کہ جوانوں سے سب کچھ لے لیا گیا ہے دیا کچھ بھی نہیں ہے۔انہیں اتنی اجازت نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے رفیقِ سفر تلاش کر لیں، اپنی خواہش کے مطابق کوئی پیشہ اختیار کر لیں، ان کے پاؤں میں زنجیریں ہیں، سلاسل ہیں، کبھی مرنے پہ پابندی کبھی جینے پر پابندی۔کہیں باپ کی نصیحتیں ہیں، کہیں استاد کے احکام ہیں، کہیں بزرگوں کی جھڑکیاں ہیں۔اگر ہمارے بزرگ ہٹ دھرم نہ ہو جائیں تو یہ جوان زندگی کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیں۔یہ دنیا اتنی تلخ اتنی ناقابلِ برداشت نہ

ہوتی لیکن کارخانے میں طوطی کی آواز کس نے سنی، مانا کہ جوانوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے لیکن چوغے اور قبا پہننے والوں نے، اعصابہ داروں نے، مذہب کے ٹھیکے داروں نے، سیاست گری نے ان کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔ کچھ بھی ہو پھر بھی جوانی زندگی کا ایک عطیہ ہوتی ہے، جسے یاد کرتے کرتے عمر بیت جاتی ہے اور زندگی کی تنہائی ختم ہو جاتی ہے۔

☆☆☆☆

حُسن۔۔ظالم۔۔مظلوم

ظالم اور مظلوم حسن خامہ فرسائی سے پہلے ایک بات یاد آ رہی ہے، ڈر ہے کہ کہیں بھول نہ جاؤں اس لیے شروع ہی میں کرلوں۔ دراصل اب اس عمر میں کچھ چیزیں بھولنے لگی ہیں اور کچھ یاد آنے لگی ہیں، کبھی لگتا ہے کہ صبح کی بھی کوئی بات یاد نہیں اور کبھی لگتا ہے کہ جانے کیا کیا کچھ یاد ہے۔ ہاں تو ایک بات مجھے یاد آ رہی ہے ایک بزرگ تھے کوئی 85 سال کے اور میں کوئی 22 سال کا تھا، میرا دل نیا نیا دھڑکنے لگا تھا اور جذبات سے کچھ تعلقِ خاطر ہونے لگا تھا۔ رگوں میں قدرے تیزی سے خون گردش کرنے لگا تھا۔ ہاں تو وہ بزرگ مجھ سے باتیں کرنے لگے، "سنا ہے تم نے ایم اے کرلیا ہے وہ بھی انگریزی ادب میں"، جہاں ہر بات پر کھل کر بحث ہوتی ہے اور بات کرتے وقت نہ استاد جھجھکتا ہے اور نہ ہی طالب علم۔ جو جی میں آئے پوچھ لیجئے جو جی میں آیا کہہ دیجئے، میں نے کہا، "پوچھیئے آپ کو کیا پوچھنا ہے"؟

انہوں نے کہا نوجوان یہ بتاؤ کہ "پہلے کون پیدا ہوا تھا عشق، عاشق یا معشوق"

میں چپ سا ہو گیا، کوئی جواب نہ بن پڑا،

وہ بولے "بولتی بند ہو گئی میاں"

بہر حال میں کوئی دلیل اور جواب نہ دے پایا۔ لیکن اگر وہ مجھ سے پوچھتے کہ حُسن پہلے پیدا ہوا یا حسین یا حسن گر؟ تو میں شاید جواب دے لیتا کیونکہ میں نے پڑھ رکھا تھا کہ "اللـــــه جمیل و یحب الجمال" سو بڑا آسان تھا یہ کہنا کہ پہلے حسن پیدا ہوا، بھلا اللہ سے پہلے کون پیدا ہو سکتا ہے اگر اللہ حسن ہے تو پھر پہلے پیدا ہونے والا "محسن" ہی ہوا ناں! لیکن انہوں نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا تھا لیکن مجھے ان کا خیال اس لیے آ گیا کہ یہ کم بخت، حسن و عشق شاید ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہوئے ہوں۔ ہو سکتا ہے ان کے دو باپ ہوں، ماں نے دوسری شادی

کرلی ہو جس سے عشق پیدا ہوا ہو یا حسن پیدا ہوا ہو۔ میں کس بکھیڑے میں پڑ گیا، مجھے تو حسن ظالم اور حسن مظلوم کی بات کرنا تھی حسن بڑا ظالم ہے اس کی ایک جھلک کسی پر پڑ جائے تو یوں لگتا ہے کہ بجلی کوند گئی ہو اور خرمنِ دل کو راکھ راکھ کر دیا ہو، چلیے یہ بجلی ہم میں بھری ہو گی مگر ہم تو بینائی کے عذاب سے بہت جلد نجات پا گئے تھے۔ بہر حال حسن ایک عجیب شے کا نام ہے، ویسے صرف شے نہیں ہے یہ ایک قوت ہے جو انسانوں میں جلوہ گر ہوتی ہے اور فطرت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ حسن سچ مچ ایک بجلی ہے ایک ایسی قوت ہے جس میں مقناطیسیت ہے حسن اپنی طرف اس طرح کھینچتا ہے کہ رستم زماں بھی اس کی طرف کھنچتا ہی چلا جائے۔ بادشاہ بھی اپنے تخت سے اتر کر اس کے پاؤں میں ڈھیر ہو جائے۔ یہ سائیں، فقیر، یہ صوفی، یہ وڈیرے یہ جاگیردار بڑے تزک و احتشام والے ہوتے ہیں، بڑا طمطراق ہوتا ہے ان میں اور بڑا جاہ و جلال ہوتا ہے۔ مگر جمال کے سامنے ان کی کچھ نہیں چلتی۔ بس سب کچھ بھول جاتے ہیں ہم نے کہا تھا ناں کہ کسی کے حسن کی ایک جھلک کے لئے برس ہا برس جنگیں کرنا پڑیں تو کرلی جاتی ہیں۔ اس لیے حسن میں بڑی طاقت ہے بڑی جان ہے، بہت بڑی دلکشی ہے، راتوں کی نیند اڑا دیتا ہے اور دن کا آرام رفو چکر ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی سوہنی من موہنی صورت سامنے آجائے تو پھر سب کچھ نظر آنا بند ہو جاتا ہے، کسی پھول کو دیکھئے تو اس میں اس کی صورت ہوتی ہے۔ ہوا گنگنائے تو اس کے گیت گنگناتی ہوئی نظر آتی ہے، بل کھاتی ہوئی ندیاں بھی اس کے نشے سے سرشار ہونے لگتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ساری فضاؤں، ساری ہواؤں میں وہ صورت وہ موہنی صورت ضم ہو گئی ہے، نہ کھانے کو جی چاہتا ہے نہ کچھ پینے کو، بس وہ کہیں مل جائے، وہ جس کا خیال سارے ہوش اڑا دیتا ہے اور لگنے لگتا ہے کہ نہ زندہ ہیں نہ مردہ۔

میرا ایک شاگرد تھا وہ رنگ کا تو کالا تھا، وہ ایک لڑکی کو پڑھانے جایا کرتا تھا اس کی عمر گیارہ سال تھی اور وہ کوئی 20 سال کا تھا جانے کیوں اس کا اس پر دل آ گیا، دل کیا آیا موت آ گئی۔ میں نے اس کی عجیب کیفیت دیکھی تھی ایک دفعہ آ کر میرے صوفے پر گرا اس کا کوئی بزرگ

اس کے ساتھ تھا اس نے کہا "میں اسے کہتا ہوں مردمن اس کو اٹھا لاتے ہیں"۔ پر وہ کہتا تھا نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ یہ لمبی کہانی ہے چھوڑیئے! کچھ لوگ زندگی سے سرشار حوصلے سے بھرپور مگر جب کسی مہ جبیں سے ٹاکرا ہو گیا تو وہیں گر گئے، ڈھیر ہو گئے۔ یہ حُسن کیا چیز ہے، لوگ ہمیں کیوں اچھے لگنے لگتے ہیں؟ اتنے اچھے کیوں لگتے ہیں کہ ہم ان کے بغیر اپنے آپ کو ادھورا اور نامکمل بلکہ بالکل زندگی سے عاری محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ہمیں اس کا علم اتنا نہیں، ویسے ہم پوچھتے رہتے ہیں کوئی کچھ بتاتا نہیں یا بتانے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ حُسن کا جادو ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ سر چڑھ کر بولتا ہے اور عقل و دانش علم اور حکمت یا اسی طرح نیک نیتی، قوتِ ارادی، عزم و ہمت سب کچھ دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ ہم نے ایسا سنا ہے "دروغ بر گردنِ راوی" شروع میں کہا تھا ناں کہ حُسن ظالم بھی اور مظلوم بھی، مظلوم کیسے؟ کسی حسین کو کوئی جینے ہی نہیں دیتا، کہیں سے گزرنے بھی نہیں دیتا بلکہ کچھ کرنے ہی نہیں دیتا پھر اس کی بولیاں لگنے لگتی ہیں اور کبھی کبھی ایسے ظالم لوگ اس کی زندگی سے کھیلنے لگتے ہیں۔ یہ سنا نہیں آپ نے، کہ کتنے حسین چہروں پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے، حُسن اس وقت کتنا مظلوم ہوتا ہے اور یہ جھوٹا عاشق اپنی ہوس کو بجھانے کے لیے کتنے ظلم ڈھاتا ہے بلکہ ستم توڑتا ہے۔ یہ ظلم تو چلتا ہی رہتا ہے ویسے جب تک معاشرے میں مساوات کا دور دورہ نہیں ہو گا، جب تک ایک طبقہ ظالم اور دوسرا مظلوم رہے گا، ایک ہاتھ دینے والا اور ایک ہاتھ لینے والا ہو گا، ایک آقا ہو گا اور ایک غلام ہو گا تو حسن کی نیلامی لگتی رہے گی، اس پر ظلم ہوتا رہے گا لیکن یہ کب ہو گا یہ معلوم نہیں، ویسے یہ شاید ہو گا۔ فیضؔ کا بھی خیال ہے اور اقبالؔ کا بھی خیال تھا، شیلی بھی سوچتا تھا۔ بڑے بڑے دانشوروں کا بھی یہی خیال تھا کہ آخر سنہری دور کبھی تو آئے گا، کبھی تو حُسن و عشق کا معانقہ ہو گا اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنا سہنا سیکھ لیں گے، ابھی تک جانے کیوں ہم نے نسوانی حُسن کی بات کر ڈالی ہے بڑی غلط بات ہے۔ حُسن تو پوری کائنات میں بکھرا پڑا ہے۔ وہ انکل ورڈزورتھ کو آپ نے پڑھا ہے ناں! آپ ہنس رہے ہیں اگر چچا غالب ہو سکتا ہے تو انکل ورڈزورتھ کیوں نہیں؟ اسے نسوانی حُسن سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ایک 14 سالہ دوشیزہ حُسن کا پیکر

گھاس کاٹ رہی ہوتی ہے اور گا رہی ہوتی ہے ورڈزورتھ کہتا ہے کہ چپکے سے گزر جاؤ اپنے آپ کو کہتا ہے اس کے گیت میں خلل مت ڈالو، اس کا گیت اپنے تخیل کے نہاں خانے میں لے کر وہ آگے کی جانب بڑھ جاتا ہے ہاں ورڈزورتھ کو فطرت کا حُسن پسند تھا، بدقسمتی سے ہم نے فطرت کے حسن کا گلا دبا دیا ہے، گاؤں کو قبروں میں دفن کر کے شہر آباد کر دیے ہیں، درختوں پھلوں پھولوں کا قتلِ عام کر کے مصنوعی الیکٹرونکس کا سہارا ڈھونڈنے لگے ہیں مگر ورڈزورتھ کے دَور میں ایسا نہیں تھا اور ہمارے آبا واجداد کے ادوار میں بھی ایسا نہیں تھا، فطرت کا حُسن بڑا دلکش ہوتا تھا، سورج کی روپہلی کرنوں کو دیکھ کر لوگ شاعر بن جاتے تھے، پھولوں اور کلیوں میں زندگی نظر آتی تھی، بل کھاتی ندیاں، گل پوش پہاڑ، چاندنی میں نہائی ہوئی دھرتی، جگ مگ کرتا آسمان، چاند کی موہنی سی شکل، ستاروں کی جلوہ ریزیاں، سب بڑی حسین لگتی تھیں، بڑی دلکش لگتیں اور زندگی عطا کرتیں۔ یہ بھی ایک حُسن تھا، ہوش رُبا حُسن، جاں فزا حُسن، نظر نواز حسن۔ ورڈزورتھ کو فطرت کا پجاری کہا جانے لگا تھا لیکن یار لوگوں نے ورڈزورتھ کو بھی نہیں بخشا۔ انہوں نے کہا کیا وہ فطرت کو صرف ایک آنکھ سے دیکھتا تھا اگر دوسری ہوتی تو اسے افریقہ کے صحرا نظر آتے۔ بنگال کے بلاخیز طوفان نظر آتے، انسانوں کو جھلسا دینے والی دھوپ دکھائی دیتیں تو اسے پتہ چلتا کہ فطرت کتنی ظالم اور سفاک بھی ہے، چھوڑیے ان ناقدوں کا کیا ہے یہ تو کسی کو بھی نہیں بخشتے ایک بار پھر ہم ورڈزورتھ کی دنیا میں لوٹتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ فطرت کا حسن، نسوانی حسن سے کم نہیں لیکن فطرت کے حسن کے نظارے سے دل نہیں دھڑکتا یا شاید فطرت کا دل نہیں ہوتا، نسوانی حسن بولتا ہے، اس کی باتوں سے خوشبو آتی ہے، تو رنگ باتیں کرتے ہیں اور اس میں ایک ایسی جاذبیت ہوتی ہے جس سے بچنا محال ہے، یہ اس کی جنسی اپیل ہی سہی یہ اپیل بھی بڑی خوفناک ہوتی ہے اور اگر اس کی لت پڑ جائے تو پھر سیاہ لیلیٰ بھی حُسن کا پیکر بن جاتی ہے یہ بھی کہتے ہیں کہ حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے، اشیا میں نہیں، ہاں! یہ بھی ٹھیک ہوگا لیکن بسا اوقات ہمیں جس سے پیار ہو جائے وہی حسین نظر آنے لگتا ہے، سب سے حسین۔ یہ پیار بھی عجیب شے ہے، اس کا ذکر ہم کر آئے

ہیں، اب دہرائیں گے نہیں، بے کار ہے، فضول ہے، لیکن ہے بڑی تلخ حقیقت۔ 100 حسینائیں کھڑی ہوں لیکن جس پہ آپ کو پیار آ گیا وہی سب کچھ ہے وہی حسین ترین ہے، وہی زندگی ہے وہی دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے، یہ سچ ہے کہ کیٹس نے کہا تھا کہ حسین چیز ہمیشہ کے لیے حسین رہتی ہے لیکن زندگی میں یہ سچ سچ نظر نہیں آتا ہم نے دیکھا جس پر آپ جان دیتے تھے مرتے تھے لُٹتے تھے جب وہ حاصل ہو گئی سب دلکشی جاتی رہی اور پھر مرد کی مردانگی جاگ اٹھتی ہے پھر وہ کسی اور منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے، یہ بہت تکلیف دہ بات ہے مگر بات ہے ضرور! چلیے چھوڑیے! ہمیں کیا لینا دینا۔ سچ تو یہ ہے کہ لوگ اگر حسن کے پجاری نہ ہوتے تو نہ شعر کہتے، نہ افسانہ لکھتے، نہ جذبوں کے اسیر ہوتے، نہ خوابوں میں کھو جاتے اور نہ یوں زندگی حسن پر فدا کرتے، اس پر نثار ہو جاتے۔ جو بھی ہو بات بنتی نظر نہیں آتی، ہم نے جو کچھ کہنا تھا نہیں کہہ پائے ہیں، بھلا حسن پر حرفِ آخر کون کہہ سکتا ہے؟ کم از کم ہم تو نہیں کہہ سکتے۔

☆☆☆☆

بھوک

طرفہ تماشا یہ ہے کہ بھوکوں پر جن کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں وہی گفتگو کرتے ہیں بڑی بڑی کہانیاں رقم کرتے ہیں ڈرامے سٹیج ہوتے ہیں اور بڑی بڑی محافل میں گفتگو ہوتی ہے۔ لیکن بھوکے، بھوکے ہی رہ جاتے ہیں اور کسی کے پاس ان کی بھوک کا علاج نہیں۔ ہاں! قلم کاروں کو ایک خوبصورت موضوع ضرور مل جاتا ہے اور پھر دیکھئے ان کے قلم کی روانی ان کے تخیل کی جولانی جو کسی طرح زبانی جمع خرچ سے کم نہیں ہوتی۔

بہر کیف بھوک بھوک ہوتی ہے بڑی ہی خوفناک۔ ویسے پیٹ ہمارا بھی بھرا رہتا ہے بلکہ ہم اپنے پیٹ کی پوجا ہی میں لگے رہتے ہیں ضرورت تو ہمیں ایک دن کے کھانے کی ہوتی ہے ہم پورے سال کا دانہ پانی جمع کر لیتے ہیں بلکہ گودام بھر لیتے ہیں کوئی بھوکا مرے ہماری بلا سے اخیر شکر ہے ہمارے پاس گودام نہیں نہ ہم زمیندار ہیں ہم بھی قلم کار ہی ہیں اور قلم کار ہمیشہ بھوکے ہی رہتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے قلم کو بیچنے لگیں کسی کی قصیدہ خوانی کرنے لگیں کسی کے بارے میں تعریف وتوصیف سے حد سے گزر جائیں تو ان کے گودام بھی بھر سکتے ہیں۔ یہ بات بھی درست ہے کہ بھوک بھوکوں نے پیدا نہیں کی شکم سیروں نے کی ہے جو اپنا بھی کھا جاتے ہیں اوران کے حصے کا بھی۔ اصل بھوکے تو وہ ہوئے نا جن کا پیٹ بھرتا ہی نہیں اور مغرب ہی کو لے لیجئے دنیا کے ۸۰ فیصد زمینی اور آسمانی ذرائع ان کے پاس ہیں ساری معدنیات ساری مصنوعات اور سارا دھن ان کے پاس ہے اور وہ اس پر اتراتے ہیں اور کبھی کبھی غریب ملکوں کے بارے میں لفظی جمع خرچ کر دیتے ہیں اور کچھ نہ کچھ دے بھی دیتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھوکوں کی بھوک اتنی بڑھے کہ وہ ان کو کاٹ کھائیں اور ان عرصہ حیات تنگ کر دیں۔ شکم سیر فرانس کے انقلاب اور روسی انقلاب کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ جب یہ ان ملکوں کے بھوکے اٹھے تو انہوں نے ساری حسرتیں نکال لیں، جس کے ہاتھ نرم و نازک تھے اسے تہہ تیغ کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا ہاتھ سے کام کرنے

کیلئے ہم ہی بچے ہیں ہم ہی رہ گئے ہیں، انقلاب فرانس کی خون آشام حکایت سبھی کو معلوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خزانے پر بیٹھے ہوئے سانپ کبھی کبھی خوفزدہ ہو جاتے ہیں کہیں ان کے سر پہ ڈنڈا نہ آن لگے اور ان کی جان جان آفرین کے سپرد نہ ہو جائے، ویسے جن کے پاس سب کچھ ہوتا ہے، جن کے گودام بھرے ہوتے ہیں، جن کے خزانے لبریز ہوتے ہیں، اصل بھوکے وہی ہوتے ہیں۔ اپنے سیاست کاروں کو لے لیجئے اشرافیہ کی بات کر لیجئے اور اپنے وڈیروں کے قصے سن لیجئے ان کی بھوک روٹی کی نہیں ہوتی بلکہ کھنکتے ہوئے سکوں کی ہوتی ہے، سکے بھی اربوں اور کھربوں ہونے چاہئیں، ان کی زبانیں تبھی دستوں کی بات کرتے نہیں تھکتیں، انہیں وہی خوف رہتا ہے جن کا ذکر ہم کر آئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ بھوک ہزاروں روپ، ہزاروں شکلیں اختیار کر لیتی ہے، دولت کی بھوک تو عام بھوک ہے، آپ جنسی بھوک کے بارے میں کیا کہیں گے یہ سارے حصے کہانیاں آپ کو معلوم ہیں فرائیڈ نے ان بھوکوں کی نفسیات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے وہ کہتا ہے اور ٹھیک ہی کہتا نظر آتا ہے کہ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو جنسی بھوک بھی ساتھ لے کر آتا ہے۔ اس طرح جنس کے مارے بھی جنسی خواہش کے لئے ہر وقت ترستے رہتے ہیں۔ خیر اسے چھوڑیئے! ہمیں کسی نفسیاتی مسائل پر گفتگو نہیں کرنا، ہمیں کیا معلوم کہ نفسیات کا گورکھ دھندہ کیا ہوتا ہے یہ فرائیڈ جانے، ایڈلر جانے، یونگ جانے اور جانے کون کون جانے۔ ہم تو انجانے میں ہی سب کچھ کرتے رہتے ہیں ہمارا انجانہ پن ان کے جاننے سے بعض اوقات سبقت لے جاتا ہے۔ جنس کی بھوک کو دفعہ کیجئے گندی باتیں نہیں کرتے! چلیئے چھوڑیئے! بھوک کی ایک قسم شہرت کی بھوک بھی ہے یہ شہرت کے بھوکے جانے کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں اور کس کس سے مطلب براری کرتے ہیں اپنا قد بڑھانے کے لئے، یہ تو سنا تھا کہ بڑی ایڑیوں والی جوتیاں اس وقت معرض وجود میں آئی تھیں جب کسی نے کسی خاتون کی پیشانی پر بوسا لیا تھا۔

یہ اونچی ایڑیوں والی جوتیاں سب پہنتے ہیں جنہیں بوسے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ بھی

پہنتے ہیں انہیں شہرت کا بوسہ چاہیے ہوتا ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کی بلند و بالا شخصیت کو چومیں سجدے کریں تعریف کے پل باندھیں لیکن ان بھوکوں کی بھوک بدستور قائم رہتی ہے۔بھوک کی ایک قسم اور بھی ہے اور وہ بھوک ہوتی ہے خواہشات کی،بلند و بالا خواہشات،سب کچھ سمیٹنے کی خواہش،دوسروں کی دوسروں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کی خواہش،یہ وہی خواہش ہے جو مجرموں پر بھوکے شیر چھوڑ کر بجھتی تھی۔یا ریچھ پر کتے یا مرغ سے مرغا لڑانے کی خواہش،یہ خواہش کسی کو اذیت دے کر پوری ہوتی ہے مزہ آتا ہے کہ کیسے خون بہہ رہا ہے کیسے ہڈی بوٹی الگ الگ ہو رہی ہے آپ نے بیلوں کی کشتی تو دیکھی ہوگی اور باکسنگ بھی کمال کی شے ہے،کسی کا ناک ٹوٹے،کسی کے ہونٹ سے خون بہنے لگے،کوئی چت زمین پر گر جائے،بے ہوش ہو جائے،اُدھر تالیاں ہی تالیاں،واہ واہ! کیا شاندار خون بہہ رہا ہے بڑا مزہ آیا۔لیکن یہ بھوکے نہیں جانتے چلیئے چھوڑیئے ہمیں کیا ہم تو بھوک کا ذکر کر رہے ہیں ویسے بھوک کسی کے بس میں ہوئی بھی نہیں کتنے آسمانی صحیفے آئے کتنے مصلحین نے وعظ و پند کے دفتر کھولے،کتنے علماء فضلا نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے اخلاقیات کے درس دیئے لیکن انسان شاید نہیں ہے جہاں تھا کیونکہ وہ ازلی ابدی بھوکا ہے اس کی بھوک نہیں مٹتی ویسے کان میں کہہ دوں! یہ بھوک ہمیں شاید جد امجد سے ملی ہے چاہے اس کی بھوک مصنوعی ہو یا لاشعوری لیکن بھوک کہلائے گی۔پہلے انسان کو یعنی آدمؑ کو سب کچھ عطا کر دیا گیا تھا،جنت میں بے بہا نعمتیں دی گئیں،سب کچھ اس کے زیرِ اثر تھا فرشتے سجدہ ریز ہو چکے تھے جس نے سجدہ نہیں کیا تھا وہ شیطان ٹھہرا تھا،اس آدم کو منع کیا گیا تھا کہ وہ جو چاہے کھائے مگر ایک درخت کے پاس نہ جائے،کوئی کہتا ہے کہ وہ سیب کا درخت تھا،کوئی کہتا ہے کہ وہ گندم کا دانہ تھا یا گندم کا کھیت تھا۔حضرت آدمؑ اللہ کا چہیتا ہونے کے باوجود اس کی پابندی نہ کر سکے،پھر رو رو کر معافی مانگنی پڑی اور قبول ہوگئی انعام و اکرام کی بارش ہوئی لیکن ایک بات ضرور ہے کہ شاید آدمؑ کو بھی بھوک لگی ہوگی،اس بھوک کے کتنے لبادے ہیں،کتنے پیرہن،کتنے بھیس،خود ہمیں بھی معلوم نہیں،ویسے ہمیں بھی بڑی بھوک لگتی ہے،وقتاً فوقتاً لگتی رہتی ہے،ذرا دیر کو کچھ کھانے کو نہ ملے تو لگتا

ہے کہ جان نکل جائے گی لیکن اس وقت ہم بھول جاتے ہیں کہ کتنے ہیں جنہیں دو وقت کا کھانا بھی میسر نہیں،یہ کیا ہوا ہم تو اوٹ پٹانگ باتیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ہماری یہ تخلیق "اوٹ پٹانگ" کے لئے وقف ہے ہم نے تو سنجیدہ باتیں کر دیں شاید ہم نے سوتے جاگتے میں یہ تحریر نذر قارئین کی اب ہم اتنا زیادہ لکھ چکے ہیں بلکہ اس قدر اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں کہ اوٹ پٹانگ کے لئے کچھ بچا ہی نہیں ویسے آپ چاہیں تو اسے ہی اوٹ پٹانگ سمجھ لیں۔وہ پڑھا ہے نا! آپ نے کہ ایک جوان ۲۴۰ کلو کا ہو گیا پر اس کی بھوک نہیں مٹی اور جان دے دی وہ بھوکا تو نمایاں ہو گیا تھا لیکن کتنے بھوکے ہیں جن کا سوراغ لگانا ہی مشکل ہے یہ بھوکے جیسا ہم نے کہا نت نئی شکل اختیار کر لیتے ہیں،نت نئے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور جب بھوکوں کے لئے اپنی آواز بلند کرتے ہیں تو کرتے ہی چلے جاتے ہیں اگرچہ انہیں بھوکوں کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ویسے اس سنجیدہ دور میں غیر سنجیدہ باتوں کا کوئی مقام ہے ہی نہیں۔کون کہتا ہے کہ وہ مسخرہ ہے کون کہتا ہے کہ وہ احمق ہے لیکن ہماری رائے یہ ہے اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جہاں سب گدھے ہوں وہاں گدھا بننے میں کوئی حرج بھی نہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ گدھا بن کر بھی ہم گدھا نہیں بن سکتے کیونکہ ہماری پیدائش آدم کی جون سے ہوئی ہے اور ہم انسان ہی رہنا چاہتے ہیں۔

بہر کیف زیرِ نظر موضوع پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن سب بے کار سعی لا حاصل، بھوکوں کو بھوکا ہی رہنا ہے اور ایک دانشور نے کہا تھا کہ بھوکا رہنے کے اپنے مزے ہیں بھوک نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔یہ جتنے فنونِ لطیفہ ہیں سب بھوک کی پیداوار ہیں یہ شاعری،مصوری،سنگ تراشی،موسیقی،ڈرامہ اور دیگر کئی فنون سب بھوک کی پیداوار ہیں،ایک بھوکا فنکار تھا بادشاہ نے اسے اپنے دربار میں بلا لیا اور اسے سب کچھ ملنے لگا تو اسکا فن رفو چکر ہو گیا بس جہاں شکم سیروں کی ضرورت ہے وہاں بھوکوں کا وجود بھی ناگزیر ہے لیکن ہم ایسے بھوکے ہونا نہیں چاہتے۔بہت خوفناک ہوتی ہے یہ بھوک! ہر طرح کی بھوک،ہر ڈھنگ کی بھوک،تن کی بھوک،بھوک ہی بھوک!

ذہنی خرافات

خرافات، لغویات یا عرفِ عام میں کہہ لیجئے فضولیات بعض اوقات بڑا لطف دے جاتی ہیں۔ بے تکی باتوں میں جتنا مزہ آتا ہے۔ وہ تُک کی باتوں میں نہیں آتا۔ ہمیں تُک سے کوئی غرض نہیں ہے، بے تکا پن اچھا لگتا ہے، یہ اور بات کہ کبھی کبھی ہم بھی ہمہ داں بننے لگتے ہیں اور اپنی علمیت جھاڑنے لگتے ہیں، کبھی کبھی وہ علمیت نہ ہمیں سمجھ آتی ہے نہ ہمارے سننے والوں کو، بس تھوڑی دیر کے لئے ہم میں احساسِ تفاخر پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ احساسِ تفاخر کوئی خوشی کی بات نہیں، خوشی تو چھوٹی چھوٹی بھولی بھالی بے سروپا بے تکی باتوں میں مضمر ہے ویسے ہمارے بڑے بزرگ بھی بڑی بڑی بے تکی باتیں کرتے تھے ہمیں چچا غالب نے بھی بڑی نکتہ آفریں باتیں کیں ہیں وہ کہتا ہے کہ اللہ اپنی حوریں اپنے پاس رکھنا ہم ان بوڑھی حوروں کو لے کر کیا کریں گے۔ چچا غالب فقط آفرینی میں لاجواب تھے۔ چچا اس لئے کہہ رہے ہیں کہ چچا کہنے میں بھی مزہ آتا ہے انہوں نے عجیب نکتہ پیدا کیا کسی نے کہا ہوگا دیکھو شراب نہیں پیتے چچا غالب نے کہا چھوڑو یار شراب پینے کے بڑے فائدے ہیں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ قبر میں شراب پینے والے کے پاس فرشتے نہیں آئیں گے، یہاں شراب کے حوالے سے ایک اور بات یاد آ گئی ہمارے ایک قدر آور سیاست دان سے بھی کسی نے سوال کیا تھا کہ کیا آپ شراب پیتے ہیں انہوں نے انکار نہیں کیا تھا صرف قتیل کا یہ شعر پڑھ دیا تھا

لوگ لوگوں کا خون پیتے ہیں
میں تو پھر بھی شراب پیتا ہوں

اس طرح کی بہت سے نکتہ آفرینیاں اور بھی ہیں۔

مجھے اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر یاد آ رہا ہے۔

انہیں ذوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں بن کر

اپنے اسلاف کے حوالے سے اس طرح کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جو بظاہر بڑی بے تکی اور بے کار لگتی ہیں ہم بہت سے مفکرین کا نام لئے بغیر بہت کچھ کہہ سکتے ہیں۔ کسی نے کہا تھا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب آسمانی کتابیں نازل ہوئیں تو سارے لوگ نا خواندہ تھے ان پر کتابیں بھیجنے کا کوئی تک سمجھ میں نہیں آتا پھر اس نکتہ داں نے ایک اور بونگی ماری تھی کہ یہ جو مرنے کے بعد سزا ملے گی اس سے کیا خاک اصلاح ہوگی مزہ تو تب ہے کہ غلط کار کو زندگی میں سزا ملے۔ ہماری رائے میں زندگی میں سزا ملتی ہی رہتی ہے اگر بعد میں مل جائے تو کیا حرج ہے۔ لیکن ایک اور عجیب و غریب رائے سامنے آئی ہے اچھا ہوتا کہ ہم بوڑھے پیدا ہوتے پھر جوان ہوتے اور پھر بچے ہوتے پھر بڑا لطف رہتا بڑوں کی باتیں بڑے جانیں غلط ہیں یا سہی ہمیں فتوے صادر کرنے نہیں آتے اور پھر ہمارے فتوے مانے گا کون! ہاں ہمارے اپنے ذہن میں بھی کبھی کبھی خرافات کی محفل سج جاتی ہے ہمیں فضول باتیں سوچنے میں اور کرنے میں بڑی ہی لذت محسوس ہونے لگتی ہے، کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ یار مرنا کیا ضروری تھا اگر ہم نہ مرتے تو ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہتے تو کتنا مزہ آتا، دنیا کوئی تنگ نہیں تھی ہزاروں دنیائیں لاکھوں گروں میں آباد ہو سکتی تھیں، کبھی ایسا لگتا ہے کہ قانون کی حکومت بھی کیا فضول بات ہے قانون وہی ہوتا ہے جو دل کا قانون ہو ہماری رائے میں قانون دانوں نے محض وقت ضائع کیا ہے بھلا ان کے قوانین پر کون چلتا ہے وہ تو خود بھی نہیں چلتے، جب وہ قانون بناتے ہیں تو اس سے بچنے کے طریقے بھی انہی قوانین میں موجود ہوتے ہیں یونہی خواہ مخواہ قوانین سے کتابیں بھر دیں Law، LLM, اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں جاری ہونے لگیں سوچو تو آج سے چار سو پانچ سو سال پہلے ہزار دو ہزار سال پہلے کتنے قوانین ہوتے تھے زندگی پھر بھی جاری و ساری تھی لوگ رہتے تھے جیتے تھے اور مرتے تھے خواہ مخواہ قانون کے شکنجے میں پھنسنے

کوکسی کا جی نہیں چاہتا اور ویسے بھی جب کہیں قوانین تھے بھی تو قانون نافذ کون کرتا تھا ہمارے ہندوستان کے شہنشاہوں کو دیکھ لیجئے کبھی دکھاوے کیلئے کسی قانون کی بات کر لیتے ہوں گے وہ عدلِ جہانگیری کا بڑا نام ہے لیکن ان کا عدل شاید ان کے اپنے محلات تک محدود ہوتا ہوگا ان کو تو کبھی خبر ہوتی ہی نہیں تھی کہ ان کی سلطنت میں کیا ہو رہا ہے اور شاید یہ بھی نہ پتہ ہو کہ ان کی سلطنت کہاں سے کہاں تک ہے بس جرنیل، کرنیل اگر اس وقت تھے تو انہیں بتا دیتے ہوں گے۔

اپنے وطنِ عزیز ہی کو لے لیجئے کس نے کب قانون پر عمل کیا ہے اگر کیا ہوگا تو ہمیں علم نہیں یا ہمارا علم ناقص ہوگا دیکھو! آج پاکستان میں کرپشن کا غلغلہ ہے اور کتنے ہیں جو اس میں مبتلا ہیں یہ کرپشن لاقانونیت نہیں تو اور کیا ہے جس میں اول تا آخر ہر کوئی پھنسا ہوا نظر آتا ہے۔ G.B Shaw کے کردار کو عجیب خیال آیا تھا وہ کردار تھی مسز ڈجن، اس نے سوال اٹھایا کہ ہمارا خدا عجیب خدا ہے اس کا سورج گنہگاروں پر بھی چمکتا ہے اطاعت شعاروں پر بھی۔ مسز ڈجن کچھ بچ ہی کہتی تھی یا شاید نہیں کہتی تھی خدا کی خدا جانے، G.B Shaw کی G.B Shaw جانے! یہ کون ہوتی تھی خدا کے معاملات میں دخل دینے والی۔

ہم نے کہا نہ کہ عجیب وغریب خیالات عجیب وغریب طریقے سے پیدا ہوتے ہیں، اب محبت ہی کو لے لیجئے، یہ خانہ خراب جانے کتنے گھروں کو اجاڑ گئی ہے پھر بھی لوگ اس کا دم بھرتے نظر آتے ہیں۔ میرے ایک طالب علم نے کہا چھوڑیں جی محبت بے کار شے ہوتی ہے اس چیز سے کہیں بہتر تو نفرت ہوتی ہے اس میں بڑا مزہ آتا ہے نفرت میں انسان کا قد بلند ہو جاتا ہے اس کی سوچ ارفع ہو جاتی ہے۔ بھلا طالب علموں کے ذہن میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں انہیں ہم کیسے روک سکتے ہیں، ہمیں اجازت دینی چاہیے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کریں، وہ کہیں ہم نے پہلے بھی لکھا ہے کہ ایک بڑا سائنسدان روزانہ ایک انڈے پر بیٹھتا تھا اور پریشان ہوتا تھا کہ انڈے سے بچہ کیوں نہیں نکلا پھر دیکھا کہ اس نے کیا کیا معرکے سرانجام دیے، غالباً اس کا نام ایڈیسن تھا۔

یہ خرافات اور فضولیات اتنی بے کار بھی نہیں ہوتیں اگر یہ بے کار ہوتیں تو پھر ہمارے اردو ادب میں داستانیں کیوں تحریر کی گئیں اور انگریزی ادب میں رومانسز کیوں معرضِ وجود میں آئے بلکہ ہر ادب میں داستانوی ادب موجود ہے جس کا بڑا حصہ خرافات اور لغویات پر مشتمل ہوتا ہے جب لکھنے والے لکھتے ہیں کہ ایک ایسا قالین ہے جس پر بیٹھ کر اڑا جا سکتا ہے اور یہ کہ کوہ قاف میں پریاں موجود ہیں جو شہزادوں کو جگہ جگہ کی سیر کراتی ہیں اور یہ کہ کسی طوطے میں کسی کی جان ہوتی ہے کوئی کبوتر میلوں دور پیغام لے جاتا ہے کوئی چراغ حیرت انگیز کارنامے سرانجام دے دیتا ہے چراغ رگڑیئے تو ایک بھوت صاحب حاضر ہو جائیں گے اور کہیں گے کیا حکم ہے میرے آقا، آپ جو حکم دیں گے وہ پورا ہو جائے گا، انگوٹھی رگڑنے پر بھی کوئی بھوت حاضر ہو جائے گا، اس طرح کی ہزاروں خرافات داستانوی ادب میں بکھری پڑی ہیں اور پھر عام زندگی میں بھی خرافات ہی خرافات ہیں آپ کے گھر میں کوئی چوری ہوئی آپ نے سوچ لیا کہ کوئی جن اٹھا کر لے گیا ہوگا آپ کے سر میں درد ہوا طے پا گیا کہ یہ کسی آسیب کی کارفرمائی ہے آپ کی بھینس دودھ نہیں دیتی، آپ کا شوہر لڑتا ہے آپ کی بیوی نا ہنجار ہے آپ نے کہا کسی نے جادو کر دیا ہے گھر میں کوئی تعویز موجود ہے اس طرح کی ہزاروں توہمات ہماری زندگی کا حصہ بن گئیں ہیں یہ خرافات نہیں تو اور کیا ہیں۔ لیکن کہتے ہیں ان خرافات کے نتیجے میں ترقی کا سفر طے ہوا اور ان خرافات نے سائنسی روپ دھار لیا اڑن کھٹولا جہاز میں بدل گیا ٹیلی پیتھی نے ٹیلی فون کو جنم دیا اور وہ جو داستانوی ادب میں شہزادے اور شہزادیاں سوچتے تھے وہ حقیقت بن گیا کمپیوٹر کو الہ دین کا چراغ کہہ لیں تو حرج نہیں ہے ایک بٹن دبایئے جو چاہے ہو جائے گا اس لئے ہمارے خیال میں فضول باتیں کرتے رہنا چاہئیں، بے تکی ہانکتے رہنا چاہیے۔ کہتے ہیں گپ شپ کبھی کبھی بڑی دانشوری کو جنم دیتی ہے اس لئے دماغ پر پہرے مت بٹھایئے ہم تو نہیں بٹھاتے قسم لے لیجئے!

☆☆☆☆☆

اگر مگر

اگر مگر ۔۔لیکن ۔۔یعنی کہ ۔۔۔انشاءاللہ ۔۔۔اللہ نے چاہا ۔۔یہ ایسے الفاظ ہیں جو مزے سا ڑانے کا تیر بہدف نسخہ ہیں ۔یوں انسان جانے کتنی مصیبتوں سے بچ جاتا ہے اگر وعدہ پورا نہ ہو سکے تو خفت اور شرمندگی دامن گیر ہوگی اگر خود ہی ارادہ کر لیا ہو تو کیا فرق پڑتا ہے یہ الفاظ آپ کو تسکین دلوا دیں گے ۔آپ کو خوامخواہ کی پریشانی سے بچا دیں گے اور پھر آپ اول درجہ کے راسخ العقیدہ مسلمان بھی کہلوائیں گے ،دیکھو ماں! میں نے بھی تو کہا تھا ’’انشاءاللہ‘‘ تو پھر اللہ نے نہیں چاہا ’’اسی لئے تو آپ سے ملنے نہیں آسکا ،فلاں دن میں ضرور ملنے آؤں گا ‘‘انشاءاللہ

پھر آپ بھول گئے کسی دوست نے گلہ کیا تو اسے کہہ اٹھے ’’یار بات سنو انسان کے بس میں ہوتا کیا ہے؟ تمہیں یاد نہیں کہ میں نے تمہیں کیا کہا تھا کہ ’’انشاءاللہ‘‘ آؤں گا ،بس اللہ تعالیٰ کی مرضی نہیں تھی اسی لئے نہیں آیا‘‘۔

آپ نے فلسفہ پڑھا ہوگا کچھ ہم نے بھی پڑھنے کی جسارت کی ہے فلسفے میں بھی ’’اگر مگر‘‘ ’’آئیں بائیں شائیں‘‘ تو ہوتا ہے ۔فلسفی خود ہی سوال کرتا ہے اور خود ہی اس کا جواب بھی دے دیتا ہے ،کبھی وہ کہتا ہے کہ ’’اگر یہ دنیا والے انسانیت سے محبت کرتے تو کتنا اچھا ہوتا‘‘ لیکن اس کا جواب ملتا ہے کہ ’’یار ایسا ممکن نہیں ہے ،انسانیت سے محبت کیسے ممکن ہے کیونکہ ہر چیز کا آغاز ذات سے ہونا چاہیے ‘‘اور کوئی من چلا کہہ گیا تھا اور ٹھیک ہی تو کہہ گیا تھا ۔

اول خویش بعد درویش

وہ انگریزی میں کہتے ہیں charity begins at home تو پھر دماغ کہتا ہے یہ بات ٹھیک ہے ہاں جب ہمیں خوشی نہ ملی تو کسی کو خاک خوشی دیں گے Epicurus بھی

کہتا تھا کہ عیش اڑانی چاہیے زندگی سے پورا پورا لطف اٹھانا چاہیے جانے کل آئے کہ نہ آئے ،کل کی فکر کل پر چھوڑ دو آج کی فکر کرو اور فاتح ہندوستان ظہیر الدین بابر سے بھی یہ قول منسوب ہے ۔

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ویسے کبھی کبھی بابر صحیح کہتا ہوا لگتا ہے کیونکہ جس چیز سے ہمیں فائدہ پہنچے وہی ضروری اور اہم ہے ۔وگرنہ بات کو اگر مگر اور چونکہ چنانچہ میں ٹال دو ۔وہ بڑا فلسفی Bentham کا بھی تو یہی خیال تھا کہ ’’ہر چیز اچھا ہونے کی کسوٹی اس کی افادیت ہے ‘‘۔یہی وجہ ہے کہ یار لوگوں نے فن برائے فن کے نعرے کو احمقانہ نعرہ گردانا ،آسکر وائلڈ کیا پاگل یا دیوانہ تھا ،اس کے نزدیک ’’خوشی کا حصول ہی انسان کا اولین مقصد ہے‘‘ ۔ویسے کبھی کبھی لگتا ہے وہ ٹھیک ہی کہتا تھا ،ہم بھی تو ایسا ہی کرتے ہیں ،خود دادِ عیش دیتے ہیں ،بڑی بڑی گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں ،بڑے بڑے محلات میں رہتے ہیں اور زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے غریبوں کی حمایت کے نعرے بلند کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔بات کہاں سے چلی تھی کہاں جا نکلی یہی تو اس بدتمیز بات کا چلن ہے ،بات بڑی آزاد ہوتی ہے ،اس کے شکم سے جانے کتنی باتیں پھوٹتی ہیں اور پھوٹتی چلی جاتی ہیں وہ کسی منچلے شاعر نے کہا تھا ناں!

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

جوانی سے یاد آیا کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے اور دیوانہ پن کی مددگار اور حامی ،اگر مگر الفاظ ہی تو ہوتے ہیں ۔شاگرد استاد سے کہتا ہے ’’سر کیا کروں وقت ہی نہیں ملتا اگر ملا تو نیک نیتی سے پڑھنا شروع کر دوں گا‘‘

لیکن اگلے دن آ کر کہہ دیتا ہے کہ ’’سر کیا کروں ،کیا کر سکتا تھا میں تو بہت کچھ کرنا چاہتا تھا مگر یہ گھر والے جانے کیا کیا کام کرنے کو کہہ دیتے ہیں ،اگر مجھے وقت ملتا تو آپ کی نصیحت پر عمل ضرور کرتا مگر کمبخت وقت کہاں ملتا ہے اور جب وقت نہیں ہوتا تو آپ ہی بتایئے کہ بے چارہ

طالب علم کیا کرے وہ 24 گھنٹوں کو 48 گھنٹوں میں تو تبدیل نہیں کر سکتا"۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر مگر کے الفاظ زندگی کا سنگھار بھی ہیں اور کبھی کبھی سوہانِ روح بھی بن جاتے ہیں۔ آپ کبھی کبھی اپنے دل سے یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اگر کوئی مجھے ملنے آیا تو میں نہیں ملوں گا، میں اپنا کام کرتا رہوں گا، زندگی کا مجھ پر بھی کوئی حق ہے اور پھر "مگر" کا دھما کہ ہو جاتا ہے۔ مگر میں کیا کرتا مجھے ملنا پڑا۔۔۔۔ جو کچھ میں نے کرنا تھا وہ میں نہیں کر پایا۔۔۔۔۔ مجھے جب کوئی دوست کہتا ہے کہ انشاءاللہ میں ضرور ملنے آؤں گا تو کبھی کبھی مجھ سے یہ گناہ سرزد ہو جاتا ہے کہ یہ "انشاءاللہ" کا لفظ استعمال مت کرو اپنی بدنیتی پر پردہ ڈالنے کے لئے اللہ کو بیچ میں نہ لایا کرو اس لئے جب بھی کوئی "انشاءاللہ" کہتا ہے جانے کیوں مجھے لگنے لگتا ہے کہ یہ مجھے ٹرخا رہا ہے، بات کو ٹال رہا ہے، پکا وعدہ نہیں کر رہا ہے۔ ویسے اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بھی بات درست ہے کہ اگر آپ کوئی کام سچ مچ کرنا چاہتے ہیں تو آپ "اگر مگر" کا سہارا نہ لیں، آپ نے جو کہا ہے اسے کر گزریں۔

دراصل بات یہ ہے کہ جب ہم کوئی کام کرنے کا وعدہ کر رہے ہوتے ہیں تو ہمارے ذہن میں کہیں کہیں بدنیتی کا عنصر ضرور موجود ہوتا ہے، جب ہم کہتے ہیں کہ بھائی جو تم کام نہیں کر سکتے وہ کام کرنے کا وعدہ کیوں کرتے ہو تو جواب ملتا ہے کہ "یار کسی کا دل توڑنا کتنا گناہ ہے بے شک ہم وعدہ پورا نہیں کرتے پر کسی کا دل بھی نہیں توڑتے"۔ کہتے ہیں کہ تمہیں معلوم ہے کسی کا دل رکھنا حج اکبر سے بھی زیادہ ثواب کا باعث ہوتا ہے مگر اگر کوئی سوچنے والا ہو تو کہے کہ تم کسی کو جھوٹی تسلی دے کر بھی تو اس کے لئے عذاب کا باعث بنتے ہو اور پھر ہر بات کل پر ٹالتے رہتے ہو فکر نہ کرو تمہارا کام ہو جائے گا، انشاءاللہ اگر میرے پاس ذرائع ہوتے تو میں ضرور آپ کا کام کر دیتا۔ جب آپ اگلے دن یا کسی اور دن ملتے ہیں تو آپ کہتے ہیں "یار میں نے پوری کوشش کی مگر بس کر نہیں سکا معافی چاہتا ہوں "انشاءاللہ" آئندہ کام ہو جائے گا" وہ پھر "آئندہ" کبھی نہیں آتی لیکن "اگر مگر" کا فائدہ یہ ہے کہ بعض اوقات انسان بدمزگی سے بچ جاتا ہے۔ دوٹوک جواب دینا

واقعتاً آسان نہیں ہوتا ہم جو آپ کے سامنے بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے ہیں ہم بھی کئی دفعہ ایسا نہیں کر پاتے اور یوں "اگر مگر" ہمیں بہت سی شرمندگیوں سے نجات دلا دیتا ہے، "اگر مگر" کی ہے ای خیراں۔۔ اگر مگر زندہ باد۔۔۔۔ ویسے یہ اچھی بات نہیں ہے چلیئے! آپ اسے گناہِ کبیرہ نہ کہئے گناہِ صغیرہ کہہ سکتے ہیں۔ اگر چھوٹی سی غلطی کر کے آپ شرمندگی سے بچ جائیں اور کسی کا دل بھی رہ جائے تو کیا حرج ہے۔ حرج ہے یا نہیں یہ تو کوئی دانشور ہی بتائے گا کوئی دانا بینا ہی بتا سکتا ہے۔ پر کیا ہوئے دانشور، کہاں گئے دانا اور بینا لوگ، کیا وہ وہیں چلے گئے جہاں ہم سب کو چلے جانا ہے۔

☆☆☆☆☆

تعارف

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

پیدائش 15 مارچ 1945ء بمقام کرنال (انڈیا) مشرقی پنجاب، آٹھ سال تک عام سکول میں تعلیم پائی اور پھر بینائی ضائع ہو گئی، ان گنت مشکلات کے باوجود انہوں نے اپنا تعلیمی سفر انتہائی کامیابی سے جاری رکھا، وظائف اور اعزازات حاصل کئے۔ انتہائی اعتماد اور یقین سے عملی زندگی میں قدم رکھا، ان کی جدوجہد، مشکلات و مصائب سے دوچار لاکھوں افراد کے لئے مینارۂ نور ہے۔ وہ انگریزی میں ایم اے کرنے والے پہلے نابینا پاکستانی ہیں، پاکستان بھر میں بطور لیکچرار متعین ہونے والے پہلے فرد ہونے کا اعزاز بھی انہی کو حاصل ہے، نابیناؤں کی ملک گیر تحریک "پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ" کے ایک مدت کے لئے بیک وقت ضلعی، صوبائی اور مرکزی صدر منتخب ہوئے۔ مرکزی وزارتِ ثقافت نے انہیں زبان و ادب کی خدمات کے اعتراف میں توصیفی سند سے نوازا۔ انہیں سکاؤٹنگ کا صدارتی ایوارڈ بھی عطا کیا گیا اور محکمہ سماجی بہبود نے ان کی خدمات کے اعتراف میں گولڈ میڈل دیا۔ تعلیمی میدان میں ان کی کارکردگی بے بصر حضرات کے لئے تحریک کا باعث ہے کہ انہوں نے ایم فل میں گولڈ میڈل حاصل کیا اور (The Impact of British Poets on Iqbal) کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ تحریر کیا۔ پہلے شعری مجموعے "ساحلِ تشنہ لب" نے سرگودہا تعلیمی بورڈ کے اساتذہ کی شعری تخلیقات کے مقابلہ میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ان کی غزلیات پرمبنی معروف گلوکاروں کی آواز میں دو البم منظرِ عام پر آ چکے ہیں گلوکاروں میں بدر الزماں، فدا حسین، کوثر علی، ارشاد علی اور شکنتلا دیوی شامل ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے سنٹرل پروڈکشن یونٹ نے بھی ان کی غزلیات کو تبسم وارثی اور تسنیم کوثر کی آوازوں میں ریکارڈ کیا ہے۔ وہ علمی اور ادبی جریدے ماہنامہ "سفید چھڑی" کے بانی مدیر ہیں جو گزشتہ چھبیس سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے، وہ بے بصر افراد کے لئے ہی

خدمات سرانجام نہیں دے رہے ہیں بلکہ اپنے علاقہ رحمت پارک کی ویلفیئر سوسائٹی کے صدر کے طور پر بھی اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ ایڈیٹرز کونسل سرگودہا ڈویژن کے ایگزیکٹو باڈی کے رکن ہیں۔ گزشتہ ۳۴ سال سے "بزمِ فکر و خیال" کے پلیٹ فارم سے، جس کے وہ بانی صدر ہیں، علم و ادب کی آبیاری میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کر رہے ہیں۔

خاندانی تفصیلات:

ان کا تعلق ایک معزز گھرانے سے ہے، ان کے والد ماجد جناب شیخ اللہ دیا (مرحوم) گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب اور گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 سرگودہا میں تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہے۔ پروفیسر شیخ محمد اقبال ایک کامیاب گھریلو زندگی گزار رہے ہیں، تین بچوں کے باپ ہیں، آپ کا بیٹا تابش اقبال فوجی سیمنٹ فیکٹری میں بطور مینجر فرائض سرانجام دے رہا ہے، آپ کی بیٹی کوکب اقبال لاہور کے ایک سرکاری کالج میں انگریزی کی پروفیسر ہے اور شاعرہ بھی ہے۔ جبکہ دوسری بیٹی کشور اقبال سرگودہا کے ایک سرکاری سکول میں سینئر انگلش ٹیچر ہے۔ ان کے ایک داماد حافظ جی ایم اختر یونیورسٹی آف سرگودہا میں اسسٹنٹ رجسٹرار ہیں اور دوسرے داماد محمد یعقوب ملک ایچی سن میں شعبہ ریاضیات سے منسلک ہیں۔

موجودہ سرگرمیاں:

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ہمیشہ نئے طور اور نئی برقِ تجلی کے خواہاں رہے ہیں، وہ گزشتہ 45 سالوں سے بے بصر افراد کی تعلیم و تربیت کے لئے کوشاں ہیں اور ان کے زیرِ سرپرستی ایک ہمہ جہتی سکول "سفید چھڑی مرکز برائے نابینا افراد" نیو سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودہا میں قائم ہے۔ شاعری کے علاوہ موسیقی سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنی غزلیات کی دھنیں خود تیار کرتے ہیں الغرض ان کی پوری زندگی ایک مشن اور ایک نہ ختم ہونے والا جذبہ ہے تاکہ زندگی کو اس کے باسیوں کے لیے ایک خوب صورت اور قابلِ برداشت جگہ بنایا جا سکے۔

تصانیف

شاعری:

1۔ساحلِ تشنہ لب	(1982)
2۔سوالیہ نشان (دوایڈیشن)	(1989)(1993)
3۔اک ہمسفر اچھا لگا	(1998)
4۔تلاوتِ دل (مجموعہ حمد و نعت ؐ)	(1998)
Love's no Crime۔5	(2005)
6۔یہ کافر دل نہیں مانا	(2007)
7۔اس کے نام	(2014)
8۔نہ عشق نوں لیکاں لائیں	(2016)
9۔ابھی زندگی کا جواز ہے	(2017)

تنقید:

1۔جون ڈن شخصیت اور شاعری	(1993)
2۔اقبال، بحضورِ اقبال	(1999)
3۔جون کیٹس شخصیت اور شاعری	(2001)

نثر:

1۔ذوقِ تماشا	(1993)
2۔جہانِ مہ و پروین	(1997)
3۔دیدۂ دل	(1998)
4۔کب رات بسر ہوگی	(2001)
5۔آشوبِ آگہی	(2007)
6۔مجھے ہے حکمِ اذاں	(2012)
7۔ڈپریشن، علامات، اسباب اور علاج	(2013)
8۔یااللہ!	(2018)

خودنوشت:

1۔پردۂ سیمیں سے (چند سوانحی جھلکیاں)	(2009)

زیرِطبع:

1۔The Impact of British Poets on Iqbal (پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ)

(منجانب: انفارمیشن سیل: پی اے۔ بی۔ سرگودہا)